سلسلۂ اشاعت تنظیمِ اسلامی - ۳

ڈاکٹر اسرار احمد

بانی تنظیم اسلامی

تعارف تنظیمِ اسلامی

یکے از مطبوعات

تنظیمِ اسلامی

۶۷ - اے علامہ اقبال روڈ گڑھی شاہو لاہور - فون: ۶۳۰۵۱۱۰

تعارف
تنظیمِ اسلامی

○

پس منظر
اور
اساسی نظریات

○

ڈاکٹر اسرار احمد

نام کتابچہ ______ تعارف تنظیم اسلامی

طبع اوّل تا ششم (فروری 1991ء تا دسمبر 2001ء) ______ 14,400

طبع ہفتم (دسمبر 2004ء) ______ 1100

ناشر ______ ناظم نشرواشاعت، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت ______ 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون: 03-5869501

مطبع ______ شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

قیمت ______ 15 روپے

ترتیب

- تقدیم ——— ۴
- حصہ اوّل ——— ۲۵
  - قراردادِ تاسیس ——— ۲۶
  - توضیحات ——— ۲۸
  - تقریر مولانا امین احسن اصلاحی ——— ۳۷
  - تقریر مولانا عبدالغفار حسن ——— ۴۸
  - مولانا اصلاحی کا الوداعی خطاب ——— ۵۸
- حصہ دوم ——— ۶۵
  - عقائد یا بنیادی دینی تصورات ———
- فرائض دینی کا جامع تصور ——— ۸۱

تقدیم

تنظیمِ اسلامی اگرچہ تاحال ایک مختصر سے قافلے کی حیثیت رکھتی ہے، تاہم بحمداللہ اس کا اجمالی تعارف، کسی نہ کسی درجہ میں، نہ صرف پاکستان کے طول و عرض، بلکہ بیرونی ممالک میں بھی کم از کم اُردو بولنے والوں کی حد تک بہت وسیع پیمانے پر ہو چکا ہے ——— اندریں حالات ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ اس کے اساسی نظریات، جو تاحال مختلف کتابچوں کی صورت میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں، انہیں افادۂ عام کے لیے یکجا کر دیا جائے ——— تاکہ ایک جانب کسی بھی نئے شخص کے لیے تنظیم کے مقاصد اور نظریات کے سمجھنے میں سہولت پیدا ہو جائے، اور دوسری جانب اُس کے اہداف و مقاصد اور ہیئتِ تنظیمی کے ضمن میں جو ارتقائی عمل بروئے کار آیا ہے وہ بھی واضح اور متعین ہو جائے۔ چنانچہ یہی پیشِ نظر کتاب کی اشاعت کا اصل مقصود ہے۔

مختصر ترین الفاظ میں تنظیمِ اسلامی کی اجتماعی مساعی کے اہداف و مقاصد اور اس کی موجودہ ہیئتِ تنظیمی کا 'جامع و مانع' تعارف مندرجہ ذیل دو جملوں کے ذریعے ہو سکتا ہے جو تنظیم کے "نظام العمل" کی پہلی دفعہ (شق ا اور د) سے ماخوذ ہیں:

"۱۔ یہ ایک اصولی، اسلامی، انقلابی جماعت ہے جو پہلے پاکستان اور بالآخر کل روئے زمین پر اللہ کے دین کے غلبے یعنی اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کے قیام، یا بالفاظِ دیگر 'اسلامی انقلاب' کے لیے کوشاں ہے۔

۲۔ اس کی تنظیمی اساس 'سمع و طاعت فی المعروف' کی شخصی بیعت پر قائم ہے۔"

تاہم اس کا ایک طویل پس منظر ہے، جسے ع "دیکھئے کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک!" کے مصداق پیشِ نظر رکھنا مفید ہی نہیں ضروری ہے!

"تنظیمِ اسلامی" کا نام پہلی بار اب سے تئیس ۲۳ سال قبل اُس ہیئتِ تنظیمی کے ضمن میں سامنے آیا تھا جس کے قیام کا فیصلہ اُس اجتماع میں کیا گیا تھا جو ۸-۹ ستمبر ۱۹۶۷ء کو رحیم یار خاں میں منعقد ہوا تھا، اور جس میں لگ بھگ چالیس ۴۰ کی تعداد میں ایسے حضرات نے شرکت کی تھی جو اکثر و بیشتر ۱۹۵۷-۵۸ء میں، اور بعض بعد میں مختلف مراحل پر، جماعتِ اسلامی پاکستان سے علیحدہ ہوتے تھے ——— اُس اجتماع میں ان سطور کا عاجز و ناچیز راقم بھی شریک تھا جو علم و فضل، اور تقویٰ و تدین کے اعتبار سے تو کمترین تھا ہی، جہاں تک یاد پڑتا ہے عمر میں بھی سب سے کم تھا ——— یہ دوسری بات ہے کہ اس اجتماع کا انعقاد اصلاً اُسی کی تحریک و تحریض اور ڈیڑھ دو سال کی انتھک مساعی کا نتیجہ تھا۔

۱۹۵۷-۵۸ء کے دوران میں مولانا مودودی مرحوم کے جن قریب ترین رفقاء نے جماعتِ اسلامی سے علیحدگی اختیار کی تھی ان میں اُن چاروں حضرات کے علاوہ جنہیں مولانا مرحوم کی نظربندی کے دَوران مختلف مواقع پر امارتِ جماعت کی ذمہ داری تفویض کی جاتی رہی تھی[1] جماعت کی قیادت کی صفِ دوم کا بہت بڑا حصہ شامل تھا۔ اُن میں سے بعض حضرات تو اس درجہ مایوس اور دل شکستہ ہو گئے تھے کہ انہوں نے نئی تشکیل و تعمیر کی کسی کوشش میں قطعاً کوئی حصہ نہ لیا (جیسے مولانا عبدالجبار غازی مرحوم اور جناب سعید احمد ملک صاحب) لیکن بقیہ اکابر میں سے مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبدالغفار حسن، اور حکیم عبدالرحیم اشرف نے بھرپور کوشش کی کہ کوئی نئی ہیئتِ تنظیمی فوری طور پر وجود میں آجائے۔ ان کی اس کوشش میں جماعت سے علیحدگی اختیار کرنے والے اُن عام ارکان کی اکثریت بھی شریک تھی جو معتدبہ تعداد میں لاہور، لائلپور (حال فیصل آباد) اور منٹگمری (حال ساہیوال) سے تعلق رکھتے تھے ——— لیکن افسوس کہ مختلف اسباب کی بنا پر یہ مساعی ناکام رہیں، اور جماعت کے سابق ارکان پر مشتمل کوئی نئی اجتماعیت وجود میں نہ آسکی، جس کے نتیجے میں ایک عمومی مایوسی اور بددلی اس پورے حلقے میں پھیل گئی۔

واضح رہے کہ اگرچہ ان جملہ مساعی میں راقم الحروف بھی ایک ادنیٰ کارکن کی حیثیت سے شامل رہا تھا، تاہم ایک طویل عرصے تک ان کا اصل اعصابی مرکز بھی لائلپور رہا تھا، اور اُن کی رُوحِ رواں کی حیثیت بھی حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب ہی کو حاصل رہی تھی ——— البتہ کچھ عرصہ بعد

---

[1] یعنی مولانا عبدالجبار غازی مرحوم، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبدالغفار حسن اور شیخ سلطان احمد۔

جب محسوس ہوا کہ حکیم صاحب موصوف کچھ زیادہ ہی مایوس اور بددل ہو گئے ہیں تو راقم نے ذاتی تحریک اور منٹگمری کے احباب کے تعاون سے ایک بھرپور مشاورتی اجتماع کا اہتمام کیا جو عزیز ٹینریز ہڑپہ میں منعقد ہوا اور کئی روز تک جاری رہا۔ لیکن افسوس کہ یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ نتیجۃً مایوسی کے سائے مزید گہرے ہو گئے ——— اور ۱۹۶۱ء-۱۹۶۰ء کے لگ بھگ جماعت سے علیحدہ ہونے والے اکابر اور عام ارکان کے حلقے میں کسی نئی تعمیر و تشکیل کے ضمن میں کسی عملی سعی و جہد تو کجا مستقبل قریب میں اس کی کسی اُمید کے آثار بھی باقی نہ رہے اور بالعموم وہ فضا طاری ہو گئی جس کا نقشہ ان الفاظ میں سامنے آتا ہے کہ ع "اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا!" ——— اگرچہ بحمداللہ اس وقت بھی ذاتی طور پر راقم کے قلبی احساسات کی کیفیت یہی تھی کہ ع "آگ بجھی ہوئی نہ جان آگ دبی ہوئی سمجھ!"

راقم الحروف اوائل ۱۹۶۲ء سے اواخر ۱۹۶۵ء تک بعض خاندانی مسائل کی بنا پر کراچی میں مقیم رہا اور اس اثنا میں مولانا عبدالغفار حسن بھی مدینہ منورہ منتقل ہو گئے جہاں اُن کا تقرر جامعہ اسلامیہ میں بحیثیت استاذِ حدیث ہو گیا تھا۔

اواخر ۱۹۶۵ء میں راقم تعمیر جدید اور تشکیلِ نو کے عزمِ تازہ کے ساتھ لاہور منتقل ہوا تو اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنا وہ اختلافی بیان جو اس نے ۱۹۵۶ء میں جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کی مقرر کردہ جائزہ کمیٹی کی خدمت میں پیش کیا تھا "تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" کے نام سے شائع کر دیا، جو دینی حلقوں اور مذہبی جماعتوں کے علاوہ اخبارات و جرائد میں بھی شدومد کے ساتھ زیرِ بحث آیا، جس کے نتیجے میں 'سابقین جماعت' کے حلقے میں بھی کسی نئی تعمیر و تشکیل کی خواہش از سرِ نو انگڑائی لینے لگی۔ چنانچہ ۱۹۶۶ء میں جب مولانا عبدالغفار حسن اپنی سالانہ تعطیلات پر پاکستان آئے تو انہوں نے راقم کے ساتھ کامل اتفاق کرتے ہوئے نہ صرف کراچی اور لاہور بلکہ بعض دوسرے مقامات پر بھی سابق ارکانِ جماعت کو ایک نئی تنظیم کے قیام پر آمادہ کرنے کی بھرپور کوشش کی، اور اُن کی ان مساعی کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کے دلوں میں قیامِ اجتماعیت کی وہ چنگاری جو خاکستر کی موٹی تہہ میں دب چکی تھی دوبارہ پورے آب و تاب کے ساتھ بھڑک اُٹھی۔

مولانا موصوف تو اپنی تعطیلات کے اختتام پر واپس مدینہ منورہ چلے گئے۔ لیکن اُن کی غیر حاضری

میں شیخ سلطان احمد صاحب نے اُن کی نیابت کا حق بخوبی ادا کیا ——— اور نہ صرف مفصل خط و کتابت کے ذریعے بلکہ اپنی شدید خانگی اور کاروباری مصروفیات کے علی الرغم ایک ذریق کی حیثیت میں پاکستان کے متعدد اہم مقامات کے سفر کی صعوبت جھیل کر اس تحریک کے پودے کو پروان چڑھایا ———
نتیجۃً جون ۱۹۶۷ء میں آں محترم اور یہ خاکسار رحیم آباد ضلع رحیم یار خاں میں سردار محمد اجمل خان لغاری مرحوم کے دولتکدے پر جمع ہوئے، جہاں طویل گفت و شنید اور بحث و تمحیص کے بعد ہم تینوں نے ایک قرار داد پر دستخط ثبت کر دیئے جو جولائی ۱۹۶۷ء کے 'میثاق' میں 'قرار دادِ رحیم آباد' کے نام سے شائع ہوگئی۔
اس قرار داد کا اکثر و بیشتر حصہ تو وہی ہے جو تنظیم اسلامی کی قرار دادِ تاسیس کے عنوان سے اس کتاب کے صفحات ۴۶-۴۷ پر درج ہے۔ البتہ اُس کے پہلے پیراگراف کی بجائے "قرار دادِ رحیم آباد" میں حسب ذیل عبارت درج تھی:

"ہم اس امر پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہماری راہ کے موانع کو دُور فرمایا اور حالات کو اس طرح سازگار فرمایا کہ ہم ایک بار پھر ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے ایک مقام پر جمع ہو سکے۔
ہمارے نزدیک یہ بھی اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم اور انعام و احسان ہے کہ گفت و شنید کے نتیجہ میں ہم نے محسوس کیا کہ بحمد اللہ ہمارے نقطۂ نظر اور طرزِ فکر میں بہت حد تک یکسانی و یکرنگی موجود ہے اور ہم دین کی کسی چھوٹی یا بڑی خدمت کے لیے جمع ہو کر سعی و جہد کر سکتے ہیں۔
بنا بریں ہم یہ طے کرتے ہیں کہ ایک ایسی اجتماعیت کا قیام عمل میں لایا جائے جو دین کی جانب سے عائد کردہ جملہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ہماری ممد و معاون ہو۔ جس میں وہ لوگ بھی شریک ہو سکیں جو اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے جماعت اسلامی میں شامل ہوئے تھے لیکن پھر مختلف مراحل پر اس سے مایوس ہو کر علیحدہ ہوتے چلے گئے اور اب کسی ہیئتِ اجتماعی میں منسلک نہ ہونے کی بنا پر تشنگی محسوس کر رہے ہیں، اور وہ لوگ بھی شریک ہو سکیں جنہیں اپنے دینی فرائض کا احساس ہو جائے اور وہ اپنی اجتماعی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے کسی اجتماعی نظم میں منسلک ہونا چاہیں:

اور اختتام پر ان الفاظ کا اضافہ تھا:

"مندرجہ بالا رہنما اصولوں کی روشنی میں تفصیلی نقشۂ کار کی تعیین اور ایک ہیئتِ اجتماعی کی تشکیل کے لیے طے کیا جاتا ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو، ہم خیال لوگوں سے رابطہ قائم کیا جائے اور پھر کوئی ایسی صورت اختیار کی جائے کہ ایسے لوگ ایک جگہ جمع ہو کر کسی اجتماعیت کے قیام کی عملی صورت اختیار کر لیں۔

اس کام کی انجام دہی کے لیے فی الحال (شیخ) سلطان احمد (صاحب) کو مامور کیا جاتا ہے۔"

واضح رہے کہ اس قرارداد کو بھی الفاظ کا جامہ راقم الحروف ہی نے پہنایا تھا اور پھر جب راقم نے لاہور واپس آ کر اسے مولانا امین احسن اصلاحی کی خدمت میں پیش کیا اور اُن کی جانب سے اِس کی بحیثیتِ مجموعی تائید و تحسین کے بعد طے کیا گیا کہ اس کی ایک مختصر وضاحت بھی ضبطِ تحریر میں لے آئی جائے تو یہ خدمت بھی راقم ہی نے سرانجام دی ——— دریں اثناء لاہور میں منعقدہ ایک اجتماع میں مجوزہ اجتماعیت کے ضمن میں ایک مجلسِ مشاورت کا قیام عمل میں آ چکا تھا جس کے ایک اجلاس میں نہ صرف "قرارداد رحیم آباد" بلکہ متذکرہ بالا توضیحات کو بھی معمولی حک و اضافے کے ساتھ منظور کر لیا گیا۔ چنانچہ 'میثاق' بابت اگست ۱۹۶۷ء میں یہ تمام چیزیں "مجلسِ مشاورت" کی جانب سے شائع ہو گئیں اور اُن کی اساس پر ایک اجتماع ۸۔۹ ستمبر کو بمقام رحیم یار خاں طلب کر لیا گیا۔

رحیم یار خاں میں ۶۔۷ ستمبر کو مجلسِ مشاورت کا اجتماع ہوا ——— اور بعد ازاں ۸۔۹ ستمبر کو کھلے اجلاس ہوئے جن میں اوّلاً راقم ہی نے مجوزہ قرارداد اور اس کی توضیحات پڑھ کر سنائیں۔ پھر مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبدالغفار حسن نے مزید تائیدی اور توضیحی تقریریں کیں۔ شرکاءِ اجتماع کی جانب سے بعض لفظی ترامیم بھی پیش ہوئیں ——— اور بالآخر قرارداد کو مع توضیحات منظور کر لیا گیا، صرف اس فرق کے ساتھ کہ قرارداد رحیم آباد کے اُن ابتدائی تین پیروں کی بجائے جو اُوپر نقل ہو چکے ہیں، یہ پیرا شامل کیا گیا:

"آج ہم اللہ کا نام لے کر ایک ایسی اسلامی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کرتے ہیں جو دین کی جانب سے عائد کردہ جملہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ہماری ممد و معاون ہو۔"

اور اسی طرح "قرارداد رحیم آباد" کے محولہ بالا آخری الفاظ کی جگہ یہ الفاظ درج کیے گئے کہ:

"مندرجہ بالا رہنما اصولوں کی روشنی میں عملی جدوجہد کے آغاز اور ایک ہیئتِ اجتماعی کی باقاعدہ تشکیل کے لیے مندرجہ ذیل اصحاب پر مشتمل ایک مجلسِ مشاورت کے تقرر کی توثیق کی جاتی ہے"

۱۔ مولانا امین احسن اصلاحی ۲۔ مولانا عبدالغفار حسن
۳۔ مولانا عبدالحق حامی ۴۔ شیخ سلطان احمد (معتمد)
۵۔ سردار محمد اجمل خان لغاری ۶۔ ڈاکٹر محمد نذیر مسلم
اور ۷۔ ڈاکٹر اسرار احمد"

'میثاق' کی ستمبر اکتوبر ۱۹۶۷ء کی مشترکہ اشاعت میں ترمیم شدہ قرارداد اور توضیحات بھی شائع کر دی گئیں اور مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبدالغفار حسن کی تقاریر بھی۔ مزید برآں صرف قرارداد اور اس کی توضیحات کو "ایک نئی اسلامی تنظیم کے قیام کا فیصلہ" کے عنوان سے ایک کتابچے کی صورت میں بھی شائع کر دیا گیا تاکہ اسے زیادہ وسیع حلقے تک پہنچایا جا سکے۔

یہ عرض کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہے کہ اگرچہ اس نئی تنظیم کی سربراہی یا امارت کے لیے تاحال رسمی طور پر کسی کا نام نہ تجویز ہوا تھا نہ منظور، لیکن اس "بارات کے دولہا" بہرحال مولانا امین احسن اصلاحی ہی تھے ـــــ اور اگرچہ اس نئی ہیئتِ اجتماعی کے نام کے بارے میں بھی متعدد تجاویز کے پیش ہونے کے باوجود کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہو سکا تھا، تاہم چونکہ مولانا اصلاحی "تنظیم اسلامی" کے نام پر مُصر تھے، لہٰذا غیر رسمی طور پر یہ نام بھی تقریباً طے شدہ ہی تھا۔ (اگرچہ راقم الحروف نے یہ احتیاط ملحوظ رکھی تھی کہ یہ اسم علَم نہ 'میثاق' میں استعمال ہو نہ متذکرہ بالا کتابچے میں۔)

اجتماعِ رحیم یار خاں میں اپنے الوداعی خطاب میں بھی مولانا اصلاحی نے اپنی سابقہ تقصیر کے اعتراف کے ساتھ آئندہ کے لیے عزمِ مصمم کا اظہار کیا تھا اور اس کے بعد بھی چند ماہ تک اُن کی طبیعت میں نشاط کی کیفیت برقرار رہی اور "رخ ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا" کے سے انبساط و انشراح کا اظہار ہوتا رہا۔ چنانچہ بعض چھوٹے اسفار کے علاوہ ایک طویل سفر بھی انہوں نے ازلاہور تا سکھر بذریعہ کار، اور وہاں سے کراچی بذریعہ ریل کیا جس میں راقم بھی حضرت موسیٰؑ کے "فتیٰ" کے مانند ان کے ساتھ رہا۔

لیکن افسوس کہ ایک حادثہ تو اس سفر کے دوران سکھر میں ایک اجتماع عام کے موقع پر پیش آگیا ـــــ اور بعض دوسرے حوادث اس کے کچھ عرصہ بعد رونما ہو گئے جن کے نتیجے میں ایک جانب تو مولانا اصلاحی کی طبیعت بجھ کر رہ گئی ـــــ اور دوسری جانب بعض اہم رفقاء کے مزاج میں بھی تکدر پیدا ہو گیا ـــــ چنانچہ جماعتِ اسلامی کے ساتھ سابق تعلق کی قدرِ مشترک کی اساس پر نئی تنظیم کے قیام کی یہ آخری کوشش بھی ع "خوش درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود" کی مصداق کامل بن گئی!

تاہم راقم الحروف نے اُسی وقت طے کر لیا تھا کہ اقامتِ دین اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے بلند و بالا مقاصد کے لیے خالص اصولی اور انقلابی طریق پر جدّوجہد یا بالفاظِ دیگر اسلامی انقلاب کی سعی کے لیے ٹھیٹھ اسلامی اصولوں پر کسی نئی تحریک کے اجراء اور تنظیم کے قیام کے لیے خود اپنی بساط کے مطابق کوشش جاری رکھے گا۔ خواہ اُسے 'نئے سفر' اور نئی تعمیر و تشکیل کے لیے تنہا ہی آغاز کرنا پڑے۔

لاہور میں حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن' اور "دارالاشاعت الاسلامیہ" کا قیام اور ماہنامہ 'میثاق' کا دوبارہ اجراء پہلے ہی عمل میں آچکا تھا۔ چنانچہ قرآن حکیم کے انقلابی فکر اور ولولہ انگیز دعوت کی اساس پر ہم خیال لوگوں کا ایک بالکل نیا حلقہ وجود میں آچکا تھا جو فطری تدریج کے ساتھ مسلسل ترقی کر رہا تھا۔ چنانچہ اب راقم نے اپنے جسم و جان کی تمام توانائیوں کو بالکل یکسو ہو کر اور ع "شرطِ اوّل قدم این است کہ مجنوں باشی" کے سے انداز میں قرآن کی انقلابی دعوت کے نشر و اشاعت پر مرکوز کر دیا۔ جس کے نتیجے میں اوّلاً ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا قیام عمل میں آیا اور ۲۱ جولائی ۱۹۷۴ء کی شام کو اکیس روزہ قرآنی تربیت گاہ کے اختتام پر راقم نے اپنے اس فیصلے کا اعلان کر دیا کہ آئندہ معاملہ صرف قرآن کے درس و تدریس' اور تعلیم و تعلّم تک محدود نہیں رہے گا اور صرف 'انجمن' پر اکتفا نہیں ہو گی بلکہ اقامتِ دین کی اجتماعی جدّوجہد کے لیے ایک باضابطہ 'جماعت' کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔

راقم الحروف کی متذکرہ بالا تقریر' تسوید و تبییض کے جملہ مراحل طے کر کے بعض اضافوں کے ساتھ کچھ 'میثاق' بابت ستمبر ۱۹۷۴ء میں اور بقیہ اکتوبر اور نومبر کی مشترک اشاعت میں شائع ہو گئی۔ جس کے

لہ اس کی تفصیلی روداد کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی تالیف: "دعوتِ رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر"!

ذریعے راقم نے اپنا ذہنی و فکری پس منظر، سابقہ تحریکی و جماعتی تعلق، اور فرائضِ دینی کے بارے میں اپنا تصور پوری طرح واضح کر دیا۔ (یہ تقریر جو پہلے "سرافگندیم" کے نام سے طبع ہوتی رہی تھی اب "عزمِ تنظیم" کے عنوان سے شائع ہو رہی ہے۔)

پھر 'میثاق' بابت اکتوبر، نومبر میں راقم نے ایک جانب ایک طویل مقالے کے ذریعے امتِ مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ کے دوران عروج و زوال کے ڈھائی ادوار کی وضاحت اور تیسرے عروج کی جانب پیش قدمی کے ضمن میں ہمہ جہتی احیائی عمل کے مختلف گوشوں کی تعیین کے ساتھ یہ بات بھی واضح کر دی کہ راقم اور اس کی تجویز کردہ تنظیم اُن میں سے کون سے گوشے سے تعلق رکھتی ہے۔ اور دوسری جانب ۱۹۶۷ء کے اجتماعِ رحیم آباد کی منظور کردہ قرارداد مع توضیحات بھی شائع کر دی اور مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبدالغفار حسن کی تقاریر کے علاوہ وہ تائیدی تبصرے بھی شائع کر دیئے جو ۶۸-۱۹۶۷ء میں مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا عبدالباری ندوی رحمہما اللہ نے کیے تھے —— اور اعلان کر دیا کہ ان ہی فکری و نظری اساسات پر ایک نئی تنظیم کی تشکیل اگلے سال (۱۹۷۵ء) کے اوائل میں ہو جائے گی!

۱۹۶۷ء کی قرارداد کے بارے میں راقم الحروف کو اس وقت بھی یہ احساس تھا کہ اس میں اقامتِ دین کی فرضیت کا تصور کچھ دب گیا ہے اور اس کی اہمیت کما حقہٗ واضح نہیں ہو رہی —— اور اگرچہ دین کی اقامت کی اصطلاح اس میں موجود ہے تاہم بحیثیتِ مجموعی اس سے اصلاً ایک تبلیغی اور اصلاحی تحریک کا نقشہ سامنے آتا ہے۔ اس کا اصل سبب بھی راقم کے سامنے واضح تھا، یعنی یہ کہ جماعتِ اسلامی کی تحریک کی قلبِ ماہیت، اور ایک اسلامی انقلابی جماعت کے بجائے اسلام پسند قومی سیاسی جماعت کا انداز اختیار کر لینے اور اس کے نتیجے میں اس کے کارکنوں کے مزاج میں سیاسی رنگ کے غلبے نے سابقینِ جماعت کے حلقے میں ردِ عمل کے طور پر "دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے!" اور "سانپ کا ڈسا رسی سے بھی ڈرتا ہے!" کے مطابق "انقلاب" کے لفظ سے وحشت (Allergy) پیدا کر دی تھی —— اس کے باوجود راقم نے نئی تشکیل کے لیے قراردادِ تاسیس کے طور پر اسی کو اختیار کیا اس لیے کہ ایک تو اس کی شدید خواہش تھی کہ ۱۹۶۷ء میں جمع ہونے والے

تمام بزرگ اور احباب اس میں شمولیت اختیار کرلیں' اور اس ضمن میں اُن پر یہ حجت قائم ہو جائے کہ نئے سفر کا آغاز ٹھیک اُسی مقام سے کیا جا رہا ہے جہاں سے سات سال قبل قافلہ منتشر ہوا تھا ——— اور دوسرے یہ کہ یقین تھا کہ جیسے ہی قافلہ معروفِ سفر ہو گا سابقہ تجربات اور ایک طویل عرصے کے جمود کے باعث جو وحشت پیدا ہو گئی ہے خود بخود رفع ہو جائے گی اور ——— ع "پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود!" کے مصداق سب بھولے ہوئے سبق دوبارہ یاد آجائیں گے۔ (جس کا ایک ثبوت بھی راقم کو بالکل ابتدائی مرحلے ہی پر مل گیا تھا جس کی تفصیل یہ ہے کہ سردار محمد اجمل خاں لغاری مرحوم کے مزاج میں متذکرہ بالا وحشت کی شدت کے باعث 'قرارداد رحیم آباد' میں ان الفاظ کے بعد کہ: "لہٰذا پیش نظر اجتماعیت کی نوعیت ایسی ہونی چاہیے کہ اس میں فرد کی دینی اور اخلاقی تربیت کا کماحقہ لحاظ رکھا جائے" مزید تاکید اور حزم و احتیاط کے لیے یہ الفاظ بھی شامل تھے کہ: "اور اسے محض کسی اجتماعی انقلاب کے لیے آلۂ کار کی حیثیت نہ دے دی جائے!" ——— لیکن جیسے ہی جمود ٹوٹا اور حرکت کا آغاز ہوا تو اس وحشت کی شدت میں فوراً کمی آگئی۔ چنانچہ رحیم یار خاں میں منظور ہونے والی قرارداد سے یہ الفاظ حذف کر دیے گئے۔)

تنظیم اسلامی کا تاسیسی اجلاس ۲۷ ر اور ۲۸ ر مارچ ۱۹۷۵ء کو مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے دفتر واقع ۱۲-اے، افغانی روڈ، سمن آباد، لاہور میں منعقد ہوا جس میں لاہور کے علاوہ کراچی، سکھر، بہاولپور، ساہیوال، فیصل آباد، شیخوپورہ، گوجرانوالہ اور بعض دوسرے مقامات سے کل ایک سو تین افراد شریک ہوئے۔

ان میں اوّل تو جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کرنے والے حضرات کی کل تعداد بھی پانچ چھ سے زیادہ نہ تھی، مزید برآں وہ سب بھی جماعت کے عام ارکان میں سے تھے' اور ان میں سے کوئی بھی جماعت اسلامی میں کبھی کسی اہم منصب پر فائز نہیں رہا تھا ——— (سوائے شیخ جمیل الرحمن صاحب کے، کہ وہ کراچی کی جماعت کے معروف اور نمایاں لوگوں میں شامل رہے تھے!) ——— گویا یہ پورا قافلہ راقم کی دعوتِ قرآنی کے نتیجے میں عالمِ وجود میں آیا تھا۔ اور اس کے جملہ اساسی تصورات مطالعۂ قرآن حکیم کے اُس منتخب نصاب پر مبنی تھے جسے راقم نے اپنی دعوتِ قرآنی کا مرکز و محور بنایا تھا۔

چنانچہ راقم نے اس اجلاس کی افتتاحی نشست میں بھی ایک بار پھر اپنے مطالعۂ قرآن کا نچوڑ پیش کیا اور سورۂ صف کے دوسرے رکوع اور سورۂ حجرات کی آیات ۱۴ - ۱۵ کے حوالے سے فرائض دینی کا جامع تصور اور اس کے ضمن میں شہادت علی الناس اور غلبہ و اقامتِ دین کی جدوجہد کی فرضیت اور اس کے لیے التزام جماعت کی اہمیت پر زور دیا۔ اس کے ساتھ ہی راقم نے ۱۹۶۷ء والی قرارداد تاسیس مع توضیحات پڑھ کر سنائی اور اس کی پُرزور وکالت کی، صرف اس لیے نہیں کہ یہ اس کے اپنے رشحاتِ قلم تھے، بلکہ اس لیے کہ اقامتِ دین کے بلند و بالا مقصد کے لیے جو مردانِ کار درکار ہیں اُن کی فراہمی اور سیرت سازی کے لیے جو پروگرام اُس قرارداد اور اُس کی توضیحات کے ذریعے سامنے آتا ہے اُس کی صحت و حقانیت پر میرا دل ۱۹۷۴-۷۵ء میں بھی اتنا ہی مطمئن تھا، جتنا ۱۹۶۶-۶۷ء میں۔ اور الحمدللہ کہ ان سطور کی تحریر کے وقت بھی (جنوری ۱۹۹۱ء) راقم کو یقینِ کامل حاصل ہے کہ فرائضِ دینی کی پہلی دو منزلیں یعنی بندگیٔ رب اور شہادت علی الناس کے اصول و مبادی کے ضمن میں اس قرارداد اور اس کی توضیحات کو ایک اہم اور جامع دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔ (چنانچہ اس کتاب کا حصہ اوّل اسی قرارداد اور اس کے متعلقات پر مشتمل ہے۔) ——— بہرحال چونکہ یہ اجتماع ان ہی کی اساس پر طلب کیا گیا تھا لہٰذا اس کا کوئی امکان ہی موجود نہ تھا کہ ان کے کسی نکتے سے شرکاء اجلاس میں سے کسی کو کوئی اختلاف ہو، لہٰذا ان کی منظوری کا مرحلہ بآسانی طے ہو گیا۔

اگلا مرحلہ "نام، شرائطِ شمولیت، ہیئتِ تنظیمی، اور قواعد و ضوابط" کی منظوری کا تھا۔ جن میں سے نہ نام کے سلسلے میں کوئی ردّ و قدح ہوئی، نہ ہیئتِ تنظیمی اور قواعد و ضوابط کے ضمن میں کوئی مشکل پیش آئی، البتہ "شرائطِ شمولیت" میں شامل بعض کڑوی گولیوں کا نگلنا موجودالوقت حالات میں بہت سے احباب کو دشوار ہی نہیں محال نظر آیا۔

چنانچہ نام کے ضمن میں اتفاقِ رائے کے ساتھ "تنظیمِ اسلامی" ہی کے حق میں فیصلہ ہو گیا۔ اور اُس وقت کے دستور "تنظیمِ اسلامی کی دفعہ ۱" یہ قرار پائی:

"اس تنظیم کا نام 'تنظیم اسلامی' ہوگا۔"

اسی طرح "ہیئتِ تنظیمی" کے ضمن میں حسبِ ذیل امور بھی بالاتفاق طے پا گئے:

"دفعہ ۳ - ہیئتِ تنظیمی

تنظیمی اعتبار سے پہلے تین سال ایک عبوری دَور شمار ہوں گے جن کے دوران میں بھرپور سعی کی جائے گی کہ تجدیدِ ایمان، توبہ اور تجدیدِ عہد کی وہ دعوت زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچا دی جائے جس کی تفصیل دفعہ ۲ میں دی گئی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس میں شامل ہو سکیں۔ اس مرحلے کی تکمیل پر ایسے تمام لوگوں کا ایک عام اجتماع طلب کیا جائے گا جو تنظیم اسلامی" کے لیے مستقل دستور طے کرے گا۔ گویا دفعات آئندہ میں جو تنظیمی ڈھانچہ دیا جا رہا ہے وہ صرف

اس عبوری دَور کے لیے شمار ہوگا۔

دفعہ ۴ - مرکزی نظام

(الف) ڈاکٹر اسرار احمد کو تنظیم اسلامی کے داعیِ عمومی کی حیثیت حاصل ہوگی اور وہ اس عبوری دَور میں "اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ" کے وسیع تر اصول کے تحت تنظیم کے معاملات کو بھی چلائیں گے اور اس کی دعوت کو بھی زیادہ سے زیادہ وسیع تر حلقے تک پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ وہ ایک معین مجلسِ شوریٰ کو بھی نامزد کرنے کے مجاز ہوں گے لیکن ان کو حقِ استقرار حاصل ہوگا۔

(ب) تمام رفقائے تنظیم داعیِ عمومی کی "اطاعت فی المعروف" کے پابند ہوں گے۔"

یہ ہے "قواعد و ضوابط" ترجمہ کہ ان اصولی باتوں کے طے ہو جانے کے بعد زیادہ تفصیلی قواعد و قوانین کی چنداں ضرورت ہی باقی نہیں رہی تھی، لہٰذا وہ سب کے سب پانچ دفعات کی صورت میں کُل تین صفحات میں سما گئے اور وہ بھی بالاتفاق طے ہو گئے۔

جہاں تک متذکرہ بالا دستور کی دفعہ ۲ میں شامل "شرائطِ شمولیت" کا تعلق تھا اس کی بھی کل چھ میں سے صرف ایک یعنی چوتھی شق ایسی تھی جو بہت سے احباب کے تنظیم میں شامل ہونے کی راہ میں رکاوٹ بن گئی۔ اس لیے کہ اس کی رُو سے یہ لازم آتا تھا کہ صرف وہی لوگ تنظیمِ اسلامی میں شمولیت اختیار کر سکیں گے جو تجارتی اور نجی ہر نوع کے سُودی لین دین سے عملاً تائب ہو جائیں، اور ایسے اداروں کی ملازمت بھی ترک کر دیں جن میں سُودی لین دین کا غلبہ ہو جیسے بنک اور انشورنس کمپنیاں وغیرہ۔ مزید برآں سرکاری محاصل یعنی انکم ٹیکس، سیلز ٹیکس وغیرہ کے ضمن میں بھی کسی غلط بیانی سے ہرگز کام نہ لیں۔ ان شدید و ثقیل، اور موجود الوقت احوال و ظروف کے اعتبار سے تقریباً ناممکن العمل پابندیوں کا

نتیجہ یہ نکلا کہ اُن ایک تہتر حضرات میں سے جو اس اجتماع میں ابتداءً شریک ہوئے تھے صرف باسٹھ حضرات نے تنظیم میں بالفعل شرکت اختیار کی۔

یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ تنظیم کی "شرائطِ شمولیت" کی متذکرۂ بالا شق بھی اصلاً جماعتِ اسلامی ہی کے فلسفہ و اصولِ تنظیم کے تسلسل کی مظہر تھی۔ اور اس معاملے میں اگرچہ ذاتی طور پر راقم الحروف کے نظریات تبدیل ہو چکے تھے، تاہم چونکہ شدید دلی خواہش تھی کہ جماعت سے علیحدگی اختیار کرنے والے احباب و اکابر کی زیادہ سے زیادہ تعداد اس نئے قافلے میں شامل ہو، اور اُن کی اکثریت بالخصوص اہم شخصیتوں کے تصورات میں ابھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، لہٰذا جہاں یہ مناسب سمجھا گیا کہ تنظیم کے "مستقل دستور" کے معاملے کو ابھی کُھلا (Open) رکھا جائے وہاں "شرائطِ شمولیت" کے ضمن میں بھی سابقہ طرزِ فکر ہی کو برقرار رکھا گیا۔

تنظیم اسلامی کے ابتدائی عارضی دستور کی دفعہ نمبر ۲ صرف مذکورہ شق ۲ میں معمولی لفظی تبدیلی کے ساتھ، پیشِ نظر کتابچے کے حصۂ دوم میں "عقائد اور بنیادی دینی تصورات" کے عنوان سے شامل ہے۔ یہ بھی اصلاً راقم ہی کی تحریر پر مشتمل ہے جو جولائی ۱۹۷۴ء اور مارچ ۱۹۷۵ء کے درمیانی عرصے میں سپردِ قلم ہوئی۔ اس کی ترتیب و تسوید میں راقم نے جماعتِ اسلامی کے دستور سے بھی استفادہ کیا، اور بعض علماء سے بھی مشورہ کیا جن میں مولانا سید وصی مظہر ندوی قابلِ ذکر ہیں جو اگرچہ اُس وقت تک جماعتِ اسلامی میں شامل تھے تاہم اُن کی جماعت کی تمامی اصوبائی اور مرکزی قیادت کے ساتھ وہ کشاکش شدت کے ساتھ جاری تھی جس کے نتیجے میں وہ ۱۹۷۶ء میں جماعت سے خارج کر دیئے گئے۔

اس کی پہلی شق ایمانِ مجمل اور ایمانِ مفصل پر مشتمل ہے۔ جن کی تشریح میں اہلِ سنت کے عقائد اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ آ گئے ہیں، واضح رہے کہ جماعتِ اسلامی کے دستور میں ان کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

دوسری شق کلمۂ طیبہ اور کلمۂ شہادت پر مشتمل ہے جس کی تشریح کے سلسلے میں جماعتِ اسلامی کے دستور سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ توحیدِ الٰہی اور رسالتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے اقرار کے مضمرات و مقتضیات کو دستورِ جماعت میں بلاشبہ نہایت عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ اور ایک

روایت یہ بھی ہے کہ یہ تحریر اصلاً مولانا محمد منظور نعمانی کی ہے۔ واللہ اعلم) ـــــ البتہ ایک جانب اس میں سے وہ الفاظ حذف کر دیئے گئے جن پر علماء کرام کی جانب سے شدید اعتراضات کیے گئے تھے، اور دوسری جانب عظمتِ صحابہؓ اور حجیتِ خلافتِ راشدہ سے متعلق شقوں کا اضافہ کیا گیا۔ اس لیے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم، تربیت اور تزکیے کا شاہکار ہونے کے اعتبار سے تعظیم و توقیر کے مستحق بھی ہیں ـــــ اور بفوائے الفاظ قرآنی "مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِينَ مَعَهٗ" اور "فَالَّذِينَ اٰمَنُوا بِهٖ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ" آنحضورؐ کے رفقاء و احباب اور اعوان و انصار ہونے کی بنا پر اس کا استحقاقِ کامل بھی رکھتے ہیں کہ آنحضورؐ کے ہر اُمتی کے دل میں اُن کے لیے شدید محبت اور احسان مندی کے جذبات موجود ہوں ـــــ اور خلافتِ راشدہ چونکہ اصلاً خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی حیثیت رکھتی ہے لہٰذا اس کے دوران میں جن امور پر اُمت کا اجماع ہو گیا انہیں دین کے دستوری اور قانونی نظام میں حُجت کی حیثیت حاصل ہے ـــــ اس طرح عظمتِ صحابہؓ اور حجیتِ خلافتِ راشدہ کو گویا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالتِ مبارکہ کے ساتھ تتمے اور ضمیمے کی حیثیت حاصل ہے!

تیسری اور چوتھی شقیں شرک، کفر اور ذمائمِ اخلاق سے برأت، اور جملہ ذنوب و معاصی سے توبہ و استغفار پر مشتمل ہیں۔ جن کے ضمن میں جہاں کفر اور شرک کی حقیقت اور اُن کی اقسام کی مختصر مگر جامع وضاحت آگئی ہے وہاں فرائض و واجباتِ دینی اور محرمات و منہیاتِ شرعی کا اجمالی تذکرہ بھی ہو گیا ہے۔ اور ان ہی میں وہ "کڑوی گولیاں" بھی شامل ہیں جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے یعنی کسبِ معاش کے سلسلے میں محرمات و منکرات سے اجتناب!

جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، ابتدا میں جو صورت اختیار کی گئی وہ یہ تھی کہ صرف وہی لوگ تنظیم اسلامی میں شامل ہو سکیں گے جو ان منکرات کو بالفعل ترک کر چکے ہوں، یہی وجہ ہے کہ تاسیسی اجلاس کے ابتدائی ایک سو تین شرکاء میں سے صرف باسٹھ حضرات تنظیم میں شمولیت اختیار کر سکے! ـــــ لیکن تقریباً ڈھائی سال بعد جب تنظیم کے لیے بیعت کے نظام کو اختیار کیا گیا تو متعلقہ عبارت میں بھی مناسب لفظی ترمیم کر دی گئی اس لیے کہ نظامِ بیعت کا تو اصل الاصول ہی یہ ہے کہ کوئی شخص جب، جہاں اور جیسے ہی عزم اور ارادہ کرے کہ وہ مسلمان بنے اور مسلمان مرے گا اور اپنے جملہ فرائض دینی کو ادا کرنے کے لیے

امکان بھر کوشاں رہے گا فوراً بیعت کرکے راہِ حق کے قافلے میں شامل ہو سکتا ہے، تعلیم، تربیت اور تزکیے کے مراحل بعد میں آتے ہیں، گویا اب اس شق کی حیثیت اس پیشگی تنبیہ کی ہے کہ جو شخص بھی تنظیم میں شامل ہو وہ اچھی طرح جان لے کہ اسے ان منکرات و محرمات کو جلد از جلد ترک کرنا ہے۔

پانچویں اور چھٹی شقیں دو 'معاہدوں' پر مشتمل ہیں: پہلا عہد اللہ سے کہ میں نے اپنا رُخ ہر جانب سے یکسو ہو کر صرف تیری جانب کر لیا ہے اور اب میری نماز اور قربانی کی طرح میرا جینا اور مرنا بھی صرف تیرے لیے ہوگا ـــ اور دوسرا عہد تنظیم اسلامی سے کہ میں اس کے نظم کی پابندی اور اس کے ایسے جملہ احکام کی اطاعت جو شریعت کی کسی واضح نص کے خلاف نہ ہوں "سمع و طاعت" کی ٹھیٹھ اسلامی رُوح کے مطابق کروں گا!

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ تنظیم کے عقائد اور بنیادی دینی نظریات کی مندرجہ بالا چھ شقوں کا تعلق ان تین اہم دینی اصطلاحات سے ہے جو تنظیم اسلامی کی اساسی دعوت کے عنوان سے چند آیاتِ قرآنیہ کے ساتھ ابتداء ہی سے جلی طور پر شائع ہوتی رہی ہیں: یعنی تجدیدِ ایمان[1]، توبہ[2] اور تجدیدِ عہد[3]۔ چنانچہ پہلی دو شقوں کا تعلق تجدید ایمان سے ہے، درمیانی دو کا توبہ سے، اور آخری دو کا تجدید عہد سے!!

اللہ تعالیٰ ہم سب کے قلوب و اذہان کو ایمانِ حقیقی اور یقین و معرفت کے نور سے منور فرمائے، ہمیں جملہ فرائض و واجبات کے التزامِ تام اور منکرات و منہیات سے اجتنابِ کلی کی توفیق عطا فرمائے اور اپنے جملہ عہود و عقود کے ایفاءِ کامل کی ہمت عطا فرمائے، آمین یا ربّ العٰلمین!

ذاتی طور پر راقم الحروف کی رائے جماعت سے علیحدگی کے دو سال کے اندر اندر یعنی اپریل ۱۹۵۹ء کے لگ بھگ ہی یہ بن چکی تھی کہ اقامتِ دین کے لیے جد و جہد کرنے والی جماعت کی تنظیمی اساس بیعت کے مسنون، اور ماثور اصول پر قائم ہونی چاہیے نہ کہ عہدِ حاضر کے مغرب سے درآمد شدہ دستوری اور جمہوری اصولوں پر ـــ تاہم راقم کے نزدیک نہ مقدم الذکر ہیئتِ تنظیمی فرض یا واجب کے درجے میں ہے، نہ مؤخر الذکر مباحات کے دائرے سے خارج ہے ـــ یہی وجہ ہے کہ آٹھ سال بعد ۱۹۶۷ء میں اوکاڑہ، رحیم آباد اور پھر رحیم یار خاں میں ایک نئی تنظیم کے قیام کا فیصلہ ہوا تو راقم اس میں پورے انشراح

ہی نہیں، بھرپور جوش و خروش کے ساتھ شریک ہوا، حالانکہ جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، یہ بات اظہر من الشمس تھی کہ اس "بارات" کے "دولہا" کی حیثیت مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کو حاصل تھی، اور وہی بلاشائبہ ریب و شک مجوزہ تنظیم کے "امیر بنتے" اور اُن کے بارے میں یہ بات ظاہر و باہر اور معلوم و معروف تھی کہ اُن کا شدید رجحان ہی نہیں قطعی و حتمی رائے دستوری اور جمہوری نظامِ جماعت کے حق میں ہے ——
اسی طرح مزید آٹھ سال بعد یعنی ۱۹۷۵ء میں جب موجودہ تنظیمِ اسلامی کی تاسیس کا مرحلہ آیا تب بھی راقم نے نظامِ جماعت کے مسئلے کو "کھلا" رکھا اور پہلے تین سالوں کو عبوری دَور قرار دیتے ہوئے اپنی حیثیت صرف کنوینر کی رکھی تاکہ جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کرنے والے دوسرے بزرگ حضرات بھی شمولیت پر آمادہ ہو جائیں تو اُن کے مشورے بلکہ صوابدید کے مطابق ہیئتِ تنظیمی تشکیل دے لی جاتی! اور اس میں ہرگز کسی شک اور شبہ کی گنجائش نہ تھی کہ اگر وہ حضرات شمولیت اختیار کر لیتے تو لامحالہ ایک دستوری اور جمہوری نظم ہی قائم ہوتا۔

لیکن جب دو ڈھائی سال کے انتظار کے بعد ثابت ہو گیا کہ بزرگ سابقینِ جماعت میں سے کوئی ایک شخص بھی اس نئے قافلے میں شمولیت پر آمادہ نہیں ہے، تو چار و ناچار راقم کو یہ فیصلہ کر لینا پڑا کہ اب اسے اپنی ذاتی صوابدید ہی کو بروئے کار لانا ہے۔ اور اپنی رائے کو پورے شرح و بسط کے ساتھ رفقاء کے سامنے رکھ دینا ہے۔ تاکہ بفحوائے الفاظِ قرآنی: "لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ" (الانفال: ۴۲) جسے ساتھ دینا ہے وہ بھی پورے انشراحِ صدر کے ساتھ دے، اور جسے ساتھ چھوڑ دینا ہے وہ بھی خوب سوچ سمجھ کر علیحدہ ہو!

تنظیم کا پہلا سالانہ اجتماع ۲۵ تا ۲۷ مارچ ۷۶ء اپنے مقامِ تاسیس ہی پر منعقد ہوا تھا، اور دوسرے سالانہ اجتماع کے انعقاد کے لیے بھی اواخر مارچ ۱۹۷۷ء کی تاریخوں کا تعین ہو چکا تھا کہ اچانک ملکی انتخابات میں حکومتِ وقت کی جانب سے کی گئی دھاندلیوں کے خلاف احتجاجی مظاہرں نے ملک گیر تحریک کی صورت اختیار کر لی جو "تحریکِ نظامِ مصطفےٰ" (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام سے موسوم ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے جنگل کی آگ کی طرح پورے ملک میں پھیل گئی۔ لہٰذا تنظیم کے اجتماع کو ملتوی کرنا پڑا —— ۴ اور ۵ جولائی ۷۷ء کی درمیانی شب کو ملک میں مارشل لاء نافذ ہوا تو امن و امان کی

صورت بحال ہوتی اور چونکہ کچھ اندازہ نہ تھا کہ تین ماہ بعد مارشل لاء کے اختتام پر ملک میں دوبارہ کیسے حالات پیدا ہو جائیں، لہٰذا بعض اہم رفقاء کے مشورے سے طے کر لیا گیا کہ پہلی فرصت میں تنظیم کا ایک اجتماع منعقد کر لیا جائے جو دوسرے اور تیسرے سالانہ اجتماعات کا قائم مقام ہو اور اس میں تنظیم کے مستقل نظام کے بارے میں حتمی فیصلہ کر لیا جائے۔

یہ اجتماع جو، کچھ دو اجتماعات کے قائم مقام ہونے کے ناتے، اور کچھ اہم موضوعات پر تفصیلی گفت و شنید اور بحث و تمحیص کی ضرورت کے پیش نظر، پورے ایک ہفتے کے لیے طلب کیا گیا تھا ۵ تا ۱۱ اگست ۱۹۷۷ء قرآن اکیڈمی، ماڈل ٹاؤن، لاہور میں جاری رہا۔ اور اس میں راقم نے حسب ذیل تین تنقیحات کے ذیل میں نہ صرف یہ کہ اپنے دینی فکر کو پوری وضاحت اور شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا بلکہ جملہ شرکائے اجتماع کو بھی اظہارِ خیال اور اختلافِ رائے کا پورا موقع فراہم کیا:

"۱۔ اقامتِ دین، شہادت علی الناس، اور غلبہ و اظہارِ دین کی **سعی و جہد** نفلی عبادت **یا** اضافی نیکی نہیں بلکہ از روئے قرآن و حدیث **بنیادی دینی فرائض** میں شامل ہے!

۲۔ اس دینی فریضہ کی ادائیگی کے لیے **التزامِ جماعت** واجب ہے۔

۳۔ ایسی دینی جماعت کی ہیئتِ تنظیمی مغرب سے درآمد شدہ دستوری، قانونی اور جمہوری طرز کی نہیں بلکہ قرآن و سنت اور اسلاف کی روایات سے مطابقت رکھنے والے **بیعت** کے اصول پر مبنی ہونی چاہیے۔"

الحمد للہ کہ ان تنقیحاتِ ثلٰثہ پر پورے چھ دن سیر حاصل گفتگو ہوئی جس کے نتیجے میں شرکاءِ اجتماع کی غالب اکثریت نے راقم کے خیالات اور نظریات سے کامل اتفاق کیا اور بالآخر ناظم عمومی جناب شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کی تحریک پر حسب ذیل قرارداد منظور ہو گئی:

"تنظیم اسلامی کا یہ اجتماع عام حسب دفعہ ۳ دستور تنظیم اسلامی طے کرتا ہے کہ:

۱۔ آئندہ تنظیم اسلامی کا نظام مغرب سے درآمد شدہ دستوری قانونی اور جمہوری اصولوں کے بجائے قرآن و سنت سے ماخوذ اور اسلاف کی روایات کے مطابق بیعت کے اصول پر مبنی ہوگا۔ چنانچہ تنظیم اسلامی کے داعی عمومی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب آج کے بعد سے "امیر تنظیم اسلامی" ہوں گے۔ اور تنظیم میں داخلہ ان کے ساتھ لبیعت فی المعروف کی بیعت کا شخصی رابطہ استوار کرنے سے ہوگا اور

وہ بحیثیت امیر تنظیم اسلامی اپنے فرائض "اَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ" اور "وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ" کی قرآنی ہدایات کے مطابق ادا کریں گے۔

۲۔ اس فیصلے سے لازم آتا ہے کہ:

i۔ تنظیم اسلامی میں جو حضرات اب تک شریک رہے ہیں ان کی رفاقت آج سے ختم شمار ہو گی تاآنکہ وہ اس قرارداد کے جزو اول کے مطابق بیعت کے نظم میں شامل ہو جائیں۔

ii۔ تنظیم اسلامی کا موجودہ دستور بھی کالعدم متصور ہو گا۔ اور امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو اختیار ہو گا کہ وہ جن رفقاء سے مناسب سمجھیں مشورہ کر کے آئندہ کا دستور العمل طے کر لیں۔"

۱۸ اگست ۱۹۷۷ء کو اس قرارداد کی منظوری' اور اس پر جملہ شرکاء اجتماع کے دستخط ثبت ہونے پر گویا تنظیم اسلامی کا عبوری دَور ختم اور نیا اور مستقل دَور شروع ہو گیا۔ جو بحمد اللہ تاحال جاری ہے۔

اس عرصے کے دوران اگر کوئی خیر ذاتی طور پر راقم الحروف اور اجتماعی طور پر تنظیم اسلامی سے بن آیا ہے تو وہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور توفیق و تیسیر کا مظہر ہے' ——— اور کوتاہیاں اور لغزشیں سرزد ہوئیں تو ہمارے اپنے نفوس کی شرارتوں کی بنا پر' ——— چنانچہ آئندہ کے لیے اللہ تعالیٰ ہی سے دعا ہے کہ وہ اپنے خصوصی فضل و کرم سے نوازتے ہوئے ہدایت و استقامت میں اضافہ فرمائے' اور شیطان کے فریب اور نفس کی شرارتوں سے اپنی حفاظت میں رکھے! رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ! آمین

تنظیم اسلامی کے لیے اصولی طور پر "بیعتِ سمع و طاعت فی المعروف" کی تنظیمی اساس کو اختیار کر لینا تو مشکل نہ تھا لیکن موجودہ حالات میں اس بنیاد پر ایک جماعتی نظام کا ڈھانچہ بالفعل کھڑا کرنا ہرگز آسان نہ تھا اس لیے کہ ایک جانب یہ تصور "آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل" کے مصداق ذہنوں سے بالکل خارج ہو چکا تھا، اور دوسری جانب "بیعت" کے ساتھ ایسے بہت سے عجیب و غریب تصورات لازم و ملزوم کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں جن سے موجودہ ذہن ہی نہیں خود فطرتِ انسانی اِبا کرتی ہے ——— یہی وجہ ہے کہ ابتداء میں کچھ عرصے تک ہم خود بھی اس کے اظہار و اعلان میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے رہے کہ دنیا کیا کہے گی ——— ع "کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں!" ——— بعد میں جب اس کا

چرچا عام ہوا تو نہ صرف تمسخر اور استہزاء، بلکہ تردید اور مخالفت کا بازار بھی گرم ہوا ـــــــ لیکن بحمد اللہ اب جبکہ اس نظام کو بالفعل چلتے ہوئے چودہ برس ہونے کو آئے ہیں، اور نہ صرف اندرونِ ملک کثیر تعداد میں، بلکہ بیرونِ ملک، حتیٰ کہ انگلستان اور امریکہ میں مقیم حضرات نے بھی معتدبہ تعداد میں اپنے فرائضِ دینی کی ادائیگی کے لیے بیعت کا قلادہ گردن میں ڈالنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی ہے ہم اپنے دلوں میں گہرے تشکر آمیز اطمینان کا احساس موجزن پاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک مُردہ سنّت کے احیاء کی توفیق عطا فرمائی ـــــــ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللّٰهُ!!

بیرونی تمسخر اور مخالفت کو برداشت کرنے سے زیادہ کٹھن مرحلہ اُن غلط تصورات کے خاتمے کا تھا جو بیعت کے لفظ کے ساتھ لامحالہ وابستہ ہو گئے ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور مکروہ تصور یہ ہے کہ بیعت کے نظام میں نہ باہمی مشاورت کی کوئی گنجائش ہے نہ اختلافِ رائے اور اظہارِ خیال کا کوئی موقع! چنانچہ ہمیں اس غلط تصور کی نفی اور اس حقیقت کے اثبات میں بہت محنت بھی کرنی پڑی اور بہت سا وقت بھی صرف کرنا پڑا کہ نظامِ بیعت میں اختلافِ رائے کی گنجائش، اظہارِ خیال کے مواقع، اور باہمی مشاورت کا میدان نام نہاد جمہوری نظام سے بھی وسیع تر موجود ہے ـــــــ اور فرق صرف اتنا ہے کہ جمہوری نظام میں آخری فیصلہ بقول ع "بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے!" کے مصداق آراء کی گنتی کی بنیاد پر ہوتا ہے، جبکہ نظامِ بیعت میں اظہارِ رائے اور کھلی بحث و تمحیص کے بعد آخری فیصلہ صاحبِ امر کی صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا ہے! گویا نظامِ بیعت میں اصولِ قرآنی: "وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ" (الشوریٰ: ۳۸) کی بالفعل تعمیل حکمِ قرآنی: "وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ" (آل عمران: ۱۵۹) کے مطابق ہوتی ہے۔

دوسری جانب اس تصور کا خاتمہ بھی ہرگز آسان نہ تھا کہ مشاورتِ باہمی کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اکثریت کی رائے کو فیصلہ کن قرار دیا جائے، اس لیے کہ عہدِ حاضر میں "سلطانیٔ جمہور" کا تصور نہ صرف یہ کہ حد درجہ عالمگیر اور ہمہ گیر ہو چکا ہے بلکہ لوگوں کے شعور ہی نہیں تحت الشعور کی گہرائیوں میں اس حد تک سرایت کر چکا ہے کہ بسا اوقات بیعت کے نظام کو اصولاً تسلیم اور اختیار کرنے کے بعد بھی یہ اصرار برقرار رہتا ہے کہ امیر کو شوریٰ کی اکثریت کے فیصلے کا "پابند" ہونا چاہیے!

الغرض تنظیمِ اسلامی کے لیے بیعت کا نظام اصولی طور پر تو ۱۹۷۵ء میں اختیار کر لیا گیا تھا اور

اس کے بعد سے عملاً تنظیم کی گاڑی اسی پٹڑی پر چل رہی ہے تاہم اس کے مضمرات اور متضمنات کے واضح ہونے اور اسی کی بنیاد پر ایک جماعتی نظام کی تفصیلی تشکیل اور اس کے خدوخال کے صفحۂ قرطاس پر مرتسم ہونے میں کم وبیش دس سال کی مدت صرف ہوئی۔ اور نہ صرف اصولی غور وخوض بلکہ دس سالہ تجربات کی روشنی میں تنظیم اسلامی کے لیے ایک تحریری "نظام العمل" کی تسوید وتبییض کا مرحلہ اوائل ۱۹۸۸ء میں شروع ہوسکا۔ جبکہ تنظیم کی مرکزی مجلس مشاورت نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲، ۳ مارچ ۱۹۸۸ء میں ضابطہ طے کیا کہ:

"تنظیم اسلامی میں شمولیت کے لیے بیعت کی اساس اگرچہ دس سال قبل اختیار کرلی گئی تھی لیکن فی زمانہ کسی ہیئتِ اجتماعیہ کے لیے اس مسنون اساس کے متروک العمل ہونے کے باعث تنظیم اسلامی کو بھی اس کے عملی تقاضوں سے کامل ہم آہنگی کے ضمن میں تدریجی مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ اسی ضمن میں اگرچہ متعدد فیصلے مختلف اوقات میں کیے جاتے رہے ہیں لیکن ان کو باضابطہ ضبطِ تحریر میں نہیں لایا گیا۔ اسی طرح اگرچہ تنظیم کی قرارداد تاسیس اور اس کی توضیحات میں بعض تاریخی اسباب کی بنا پر فریضۂ اقامتِ دین کی اہمیت اور اس کے لیے جہاد فی سبیل اللہ کے لزوم کے قدرے نفی اور غیر نمایاں ہونے کے پیشِ نظر تنظیم کے آٹھویں سالانہ اجتماع میں یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ آئندہ تنظیم اسلامی محض اصلاحی اور دعوتی نہیں بلکہ انقلابی تنظیم ہوگی۔ تاہم ابھی تک یہ بات بھی پوری وضاحت کے ساتھ تحریری طور پر سامنے نہیں آئی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ان دونوں امور کو مجوزہ نظام العمل میں صراحت کے ساتھ درج کر دیا جائے اور جیسے کہ پانچ سال قبل طے کیا گیا تھا تنظیم اسلامی کی قرارداد تاسیس مع توضیحات اور شرائطِ شمولیت" پر مشتمل مفصل تحریر کو آئندہ تنظیم کی آئینی ودستوری اساس نہیں بلکہ اس کے دعوتی اور تربیتی لٹریچر کا اہم اور اساسی حصہ سمجھا جائے۔"

الحمدللہ کہ اندریں اثنا تنظیم کا تفصیلی "نظام العمل" تیار ہوکر سلسلۂ اشاعت تنظیم اسلامی نمبر ۴ کی حیثیت سے شائع ہو رہا ہے۔ جبکہ پیشِ نظر کتاب تنظیم کے اساسی نظریات کی وضاحت پر مشتمل ہونے کے ناتے اس کے دعوتی اور تربیتی لٹریچر کا اہم حصہ ہے۔

اس کتاب کے تیسرے اور مختصر ترین حصے میں "فرائضِ دینی کا جامع تصور" مختصر ترین الفاظ میں بیان ہوا ہے ——— یہ راقم الحروف کے عمر بھر کے مطالعۂ قرآن وحدیث اور سنت وسیرتِ رسول

(صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاصے اور لبِ لباب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس اعتبار سے بلاشبہ تنظیم کے اساسی دینی فکر کا جزوِ لاینفک ہے۔

راقم نے اپنے ان تصورات کے سلسلے میں علماءِ کرام سے استصواب' اور اُن کی آراء سے رفقاءِ تنظیم کو براہِ راست آگاہ کرنے کے لیے یہ اہتمام کیا کہ ۱۹۸۵ء میں تنظیم کا سالانہ اجتماع بھی ۲۳ تا ۲۸ مارچ مسلسل چھ دن جاری رہا۔ اور انہی ایام میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے سالانہ محاضرات قرآنی بھی منعقد کر لیے گئے۔ چنانچہ جامع القرآن' قرآن اکیڈمی' ماڈل ٹاؤن' لاہور میں صبح کے اوقات میں تنظیم کے سالانہ اجتماع کی کارروائی جاری رہتی تھی اور شام کو تین ساڑھے تین گھنٹے کا اجلاس محاضرات کا ہوتا تھا۔ جن کا موضوع میری یہی تحریر تھی جس پر تقریباً یک صد علماء کو اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی تھی ——— جن میں سے پچیس حضرات نے باضابطہ شرکت فرما کر بالمشافہ خطاب فرمایا اور تقریباً اتنے ہی حضرات نے اپنی آراء تحریری صورت میں ارسال کر دیں۔ چنانچہ روزانہ اوسطاً چار حضرات کا خطاب ہوا جن میں سے بعض نے میرے خیالات کی کامل تصویب فرمائی' بعض نے جزوی اتفاق کا اظہار فرمایا' بعض نے شدید تنقید کی' یہاں تک کہ بعض نے فقرے بھی چست کیے اور مذاق اُڑایا ——— الحمد للہ کہ تنظیم کے لگ بھگ ساڑھے تین سو رفقاء نے جملہ تقاریر کو پورے سکون و اطمینان' اور کامل توجہ و انہماک کے ساتھ سُنا۔ جس سے بحمد اللہ اُن کے اعتماد ہی میں اضافہ ہوا ——— اور کسی ایک کے دل میں بھی فرائضِ دینی کے اِس جامع تصور کے بارے میں کوئی اشتباہ پیدا نہ ہوا۔

ذاتی طور پر راقم کو ان محاضرات سے دو فائدے حاصل ہوئے' ایک تو دوران تحریر میں لکھی ہوئی عبارت میں بعض الفاظ کے بے محل استعمال سے جو مغالطے پیدا ہوئے اُن کی اصلاح کی صورت پیدا ہو گئی ——— اور دوسرے یہ کہ راقم کو اپنے فکر کی مجموعی تصویب مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ' مولانا مفتی سیاح الدین کاکا خیلؒ' مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری' مولانا سید مظفر حسین ندوی اور ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی ایسے اصحاب علم و فضل سے حاصل ہوئی ——— جس سے ع "متفق گردید رائے بو علی با رائے من!" کے مصداق خود راقم کے اعتماد میں اضافہ ہوا۔ فجزاھم اللہ عنی و عن جمیع رفقاء التنظیم خیر الجزاء۔ آمین

اسرار احمد

تنظیمِ اسلامی

کی اساسی دعوت

تجدیدِ ایمان	توبہ	تجدیدِ عہد

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ
الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ

(النسآء : ۱۳۶)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ۭ

(التحریم : ۸)

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ
بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ

(المآئدۃ : ۷)

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ

(البقرۃ : ۴۰)

حصۂ اوّل

○

قراردادِ تاسیس

مع

توضیحات

(منظور شدہ اجتماعِ رحیم یار خاں ۸-۹ ستمبر ۱۹۶۷ء)

اور

تقاریر مولانا امین احسن اصلاحی و مولانا عبدالغفار حسن

و

تقاریظ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ و مولانا عبدالباری ندویؒ

(شائع شدہ 'میثاق' نومبر دسمبر ۱۹۶۷ء)

قرارداد تاسیس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"آج ہم اللہ کا نام لے کر ایک ایسی اسلامی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کرتے ہیں جو دین کی جانب سے عائد کردہ جملہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ہماری ممد و معاون ہو۔

ہمارے نزدیک دین کا اصل مخاطب فرد ہے۔ اُسی کی اخلاقی و روحانی تکمیل اور فلاح و نجات، دین کا اصل موضوع ہے، اور پیشِ نظر اجتماعیت اصلاً اسی لیے مطلوب ہے کہ وہ فرد کو اس کے نصب العین یعنی رضائے الٰہی کے حصول میں مدد دے۔

لہٰذا پیشِ نظر اجتماعیت کی نوعیت ایسی ہونی چاہیے کہ اُس میں فرد کی دینی اور اخلاقی تربیت کا کما حقہٗ لحاظ رکھا جائے اور اس امر کا خصوصی اہتمام کیا جائے کہ اس کے تمام شرکاء کے دینی جذبات کو جلا حاصل ہو، ان کے علم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے، ان کے عقائد کی تصحیح و تطہیر ہو، عبادات اور اتباعِ سنّت سے اُن کا شغف اور ذوق و شوق بڑھتا چلا جائے، عملی زندگی میں حلال و حرام کے بارے میں اُن کی حس تیز تر اور اُن کا عمل زیادہ سے زیادہ مبنی بر تقویٰ ہوتا چلا جائے اور دین کی دعوت و اشاعت اور اس کی نصرت و اقامت کے لیے اُن کا جذبہ

ترقی کرتا چلا جائے۔ اِن تمام امور کے لیے ذہنی اور علمی رہنمائی کے ساتھ ساتھ عملی تربیت اور تاثیرِ صحبت کے اہتمام کی جانب خصوصی توجہ ناگزیر ہے۔

دعوت کے ضمن میں ہمارے نزدیک "الدِّینُ النَّصیحۃُ" کی رُوح اور "الاقرب فالاقرب" کی تدریج ضروری ہے۔ لہٰذا دعوت و اصلاح کے عمل کو فرد سے اوّلاً کنبہ اور خاندان اور پھر تدریجاً ماحول کی جانب بڑھنا چاہیے۔ اس ضمن میں نئی نسل کی دینی تعلیم و تربیت کا خصوصی اہتمام ناگزیر ہے۔

عامۃُ الناس کو دین کی دعوت و تبلیغ کی جو ذمہ داری امتِ مسلمہ پر بحیثیت مجموعی عائد ہوتی ہے، اس کے ضمن میں ہمارے نزدیک اہم ترین کام یہ ہے کہ جاہلیتِ قدیمہ کے باطل عقائد و رسوم اور دورِ جدید کے گمراہ کن افکار و نظریات کا مدلّل ابطال کیا جائے اور حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کے لیے کتاب و سُنّت کی ہدایت و رہنمائی کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے، تاکہ ان کی اصلی حکمت اور عقلی قدر و قیمت واضح ہو اور وہ شبہات و شکوک رفع ہوں جو اس دَور کے لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہیں۔"

توضیحات

قرار داد میں جن اُمور کی وضاحت کی گئی ہے ان میں اوّلین اور اہم ترین امر یہ ہے کہ ہمارے نزدیک دین کا اصل مخاطب فرد ہے۔ اسی کی اخلاقی اور روحانی تکمیل اور فلاح و نجات، دین کا اصل موضوع ہے اور پیشِ نظر اجتماعیت اصلاً اسی لیے مطلوب ہے کہ وہ فرد کو اس کے اصل نصب العین یعنی رضائے الٰہی کے حصول میں مدد دے۔ —— اس تصریح کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ ماضی میں مسلمانوں کو ان کی ذمہ داری تو بالکل ٹھیک یاد کرائی گئی کہ جس دین کے وہ مدعی ہیں اسے دنیا میں عملاً قائم کرنے کی سعی و جہد بھی ان پر فرض ہے اور یہ کہ دین محض ذاتی عقائد اور کچھ مراسمِ عبودیت یعنی انسان اور رب کے مابین پرائیویٹ تعلق کا نام نہیں ہے بلکہ وہ انسان کی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی کو اپنے احاطے میں لینا چاہتا ہے لیکن ان امور پر اس قدر زور دیا گیا کہ بندے اور رب کے مابین تعلق کی اہمیت اور افراد کی اپنی علمی، اخلاقی اور روحانی ترقی نظر انداز ہوتی چلی گئی۔ آئندہ جو کام پیشِ نظر ہے اس کے اصول و مبادی میں یہ نکتہ بہت زیادہ قابلِ لحاظ رہے گا کہ ایک مسلمان کا اصل نصب العین صرف نجاتِ اُخروی اور رضائے الٰہی کا حصول ہے اور اس کے لیے اسے اصل زور اپنی سیرت کے تطہیر و تزکیے اور اپنی شخصیت کی تعمیر و تکمیل پر دینا ہوگا جس سے تعلق مع اللہ اور محبتِ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اضافہ ہوتا رہے اور اس میں زیادہ سے زیادہ اخلاص پیدا ہوتا چلا جائے۔ دین کی تائید و نصرت اور شہادت و اقامت یقیناً فرائضِ دینی میں سے ہیں لیکن ان کے لیے کوئی ایسی اجتماعی جدوجہد ہرگز جائز نہیں

ہے جو افراد کو ان کے اصل نصب العین سے غافل کر کے انہیں محض ایک دنیوی انقلاب کے کارکن بنا کے رکھ دے! ـــــ چنانچہ پیش نظر اجتماعیت میں اوّلین زور افراد کی دینی و اخلاقی تربیت پر دیا جائے گا اور اس امر کا خصوصی اہتمام کیا جائے گا کہ ـــــ "اس کے تمام شرکاء کے دینی جذبات کو جِلا حاصل ہو، ان کے علم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے، ان کے عقائد کی تصحیح و تطہیر ہو، عبادات اور اتباعِ سنت سے ان کا شغف اور ذوق و شوق بڑھتا چلا جائے، عملی زندگی میں حلال و حرام کے بارے میں ان کی حس تیز تر اور ان کا عمل زیادہ سے زیادہ مبنی بر تقویٰ ہوتا چلا جائے اور دین کی دعوت و اشاعت اور اس کی نصرت و اقامت کے لیے ان کا جذبہ ترقی کرتا چلا جائے۔"

"دینی جذبات کے جِلا" کے لیے قرآن مجید کی بلاناغہ تلاوت مع تدبّر، سیرتِ نبویؐ اور سیر الصحابہؓ کا مطالعہ، مجالسِ وعظ کا انعقاد، باہمی مذاکرۂ آخرت اور مضامینِ موعظت پر مشتمل آسان لٹریچر کی اشاعت پر زور دیا جائے گا۔

"علم میں مسلسل اضافے" کے لیے عربی زبان کی تحصیل کی عام ترغیب اور اس کا اہتمام قرآنِ حکیم اور حدیثِ نبویؐ کے باقاعدہ حلقہ ہائے درس کا قیام اور جاہلیتِ قدیمہ و جدیدہ پر اسلام کے نقطۂ نظر سے تنقیدی کُتب کی نشر و اشاعت کا اہتمام کیا جائے گا۔

مندرجہ بالا دونوں اُمور سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ جاہلیتِ قدیم و جدید دونوں کے اثرات قلوب و اذہان سے محو ہوں، عقائد کی تصحیح و تطہیر ہو اور صحیح اسلامی عقائد کی تخم ریزی و آبیاری ہو سکے۔

شرکائے تنظیم کے دینی جذبات کے جِلا اور علم میں اضافے کا براہِ راست اثر عملی زندگی پر پڑے گا اور ان کی زندگیوں میں دینی تبدیلی عملاً پیدا ہوتی چلی جائے گی لیکن اس میدان میں اس امر کی شدید ضرورت ہوگی کہ اس بات کی کڑی نگرانی کی جائے کہ یہ تبدیلی

ہم جہتی ہو اور اعمالِ انسانی کے مختلف گوشوں میں متناسب انداز میں ظہور پذیر ہو۔ چنانچہ عبادات میں ذوق و شوق، معاملات میں احتیاط و تقویٰ اور دعوتی و تنظیمی سرگرمیوں میں شغف اور دلچسپی متناسب انداز میں بڑھے۔ یہ صورتِ حال کہ جلسوں کے انعقاد کے ضمن میں تو پابندی بھی ملحوظ رہے اور جوش و خروش کا بھی مظاہرہ کیا جائے لیکن نماز باجماعت کی پابندی گراں محسوس ہو اور نوافل سرے سے خارج از بحث ہو جائیں، دین کی نصرت و حمایت کا جذبہ تو ترقی کرتا چلا جائے لیکن تزکیۂ باطن کی طرف کوئی توجہ نہ دی جائے یا سنتِ نبویؐ کی حجیت و اہمیت پر دلائل تو ازبر ہوں لیکن خود اپنی زندگی میں اتباعِ نبویؐ کی جھلک نظر نہ آئے، نہ صرف یہ کہ افراد کے حق میں سمِ قاتل ہے بلکہ خود اجتماعیت کے لیے بھی سخت مُضر اور مہلک ہے ——— لہٰذا اس امر کی کڑی نگرانی ضروری ہوگی کہ شرکاء میں عبادات سے شغف، اتباعِ سُنّت کا جذبہ، معاملات میں حلال و حرام کی حُدود و قیود کی پابندی اور دعوتی و تنظیمی سرگرمیوں سے دلچسپی توافق و تناسب کے ساتھ بڑھیں۔ خصوصاً یہ احتیاط تو انتہائی لازمی ہوگی کہ پیشِ نظر اجتماعیت کے تنظیمی ڈھانچے میں جو لوگ آگے آئیں وہ تیزی و مستعدی اور نفاست و باقاعدگی سے کام کرنے کی صلاحیت کے اعتبار سے چاہے کسی قدر تہی دست ہوں، عبادات اور اتباعِ سُنّت کے ذوق و شوق سے ہرگز تہی دامن نہ ہوں۔

شرکائے جماعت میں مندرجہ بالا تبدیلیوں ——— یا بالفاظِ دیگر ان کے نفوس کے تزکیہ اور ان کی شخصیت کی دینی تعمیر کے لیے جہاں ذہنی و علمی رہنمائی اور فکری تربیت لازمی و لابُدی ہیں وہاں عملی تربیت اور تاثیرِ صحبت کا مؤثر اہتمام بھی ضروری و ناگزیر ہے۔ اس غرض کے لیے مختلف مقامات پر تربیت گاہوں کا سلسلہ بھی شروع کیا جا سکتا ہے اور ایک ایسی مرکزی تربیت گاہ کا قیام بھی عمل میں لایا جا سکتا ہے جس میں مختلف مقامات کے رفقاء گروپس (GROUPS) کی صورت میں شریک ہوں اور ایک مقررہ میعاد میں

انہیں قرآن وحدیث کے منتخب حصص کا درس بھی دیا جائے اور ایک ایسی دینی فضا بھی مہیا کی جائے جس میں ان کے دینی جذبات بھی از سرِ نو تر و تازہ ہوں اور ایک خالص اسلامی زندگی بسر کرنے کا عملی تجربہ بھی حاصل ہو جائے۔

قرارداد کے بنیادی نکات میں سے دوسرا اہم اور بنیادی نکتہ یہ ہے کہ ــــ "دعوت کے ضمن میں ہمارے نزدیک 'اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ' کی رُوح اور 'اَلْاَقْرَبُ فَالْاَقْرَبُ' کی تدریج ضروری ہے۔" پیشِ نظر اجتماعیت لازماً یہ چاہے گی کہ اس کا ہر شریک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں داعی الی اللہ اور اپنے ماحول میں حسبِ مقدور و صلاحیت اور بقدرِ ہمت و استطاعت ہدایت کا ایک روشن چراغ بن کر رہے اور اس کی شخصیت پر بحیثیتِ مجموعی داعیانہ رنگ غالب ہو جائے۔

اس دعوت کا اصل محرک ابنائے نوع کی ہمدردی اور نصح و خیر خواہی کا جذبہ ہونا چاہیے اور اس میں نہ تو اپنی شخصیت کی نمود کا کوئی شائبہ شامل ہونا چاہیے نہ طلبِ جاہ کا۔ حتیٰ کہ اللہ، رسولؐ اور شریعت کی وفاداری کے جذبے کے تحت اگر کبھی کسی فرد، گروہ یا ادارے پر تنقید کی نوبت آجائے تو اس میں بھی ہمدردی اور دلسوزی غالب رہے اور ذاتی رنجش یا انتقامِ نفس کا کوئی شائبہ نہ پیدا ہونے پائے۔

اس سلسلے میں یہ وضاحت بہت ضروری ہے کہ ــــ ہمارے معاشرے کا مجموعی مزاج اگرچہ دین سے بہت دُور جا چکا ہے اور اس اعتبار سے انتہائی اصلاح طلب ہے لیکن دعوت و اصلاح کے عمل میں دو حقائق کا لحاظ ضروری ہے۔ ایک یہ کہ یہ معاشرہ ایک مجموعی اکائی ہے اور اس کے تمام طبقات میں انحطاط سرایت کر چکا ہے۔ اس اعتبار سے اس کے مختلف طبقات میں کمیت کا تھوڑا بہت فرق چاہے موجود ہو کوئی بنیادی امتیاز موجود نہیں ہے۔ اور دوسرے یہ کہ انحطاط براہِ راست نتیجہ ہے جذباتِ ایمانی کے ضعف اور کتاب و سنّت کے علم کی کمی کا۔ اس میں دین دشمنی کا عنصر

چند ایسی استثنائی صورتوں کے سوا موجود نہیں ہے جو اگرچہ بجائے خود تو بہت خطرناک ہیں اور ان سے خبردار رہنے کی بھی ضرورت ہے تاہم مجموعی اعتبار سے ہمارے معاشرے کے عام بگاڑ کا اصل سبب دین دشمنی نہیں بلکہ دین سے لاعلمی ہے۔ حکومت اس معاشرے کا جامع عکس اور اربابِ اقتدار اس کا اہم جزو ہیں۔ ان کو اپنی اہمیت اور معاشرے میں اثر و نفوذ کی قوت و صلاحیت کے اعتبار سے دعوت و تخاطب میں اوّلیت تو دی جا سکتی ہے اور دی جانی چاہیے لیکن انہیں دین کا دشمن قرار دے کر ان کے خلاف نفرت و عداوت کے جذبات پیدا کرنے کے لیے عوام کے دینی جذبے کو مشتعل کرنا درآں حالیکہ خود عوام کی ایک عظیم اکثریت کا حال دین سے بے خبری اور عملی بُعد کے اعتبار سے خود کم و بیش وہی ہے جو اصحابِ قوت و اختیار کا ہے ان کی خیر خواہی ہے نہ خود دین کی۔ رہا اقتدار کے حصول کی خاطر برسرِ اقتدار طبقے کے مخالف و معاند کی حیثیت اختیار کرنا تو یہ ہمارے نزدیک دینی نقطۂ نگاہ سے نہایت مضر ہی نہیں سخت مہلک ہے جس سے کلّی اجتناب لازمی و لابدّی ہے۔ ہمارے نزدیک "ائمۃ المسلمین" اور "عامتھم" دونوں ہی نصح و خیر خواہی کے برابر مستحق اور دعوت و اصلاح کے یکساں محتاج ہیں!

یہاں یہ تصریح بھی ضروری ہے کہ ہماری دانست میں انتخابات کے ذریعے عمومی اصلاح کا نظریہ نری خام خیالی پر مبنی ہے، بحالاتِ موجودہ تو اس امر کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں ہے کہ انتخابات کے ذریعے اصلاح کی اُمید کی جائے ویسے بھی ہمارے راستے میں انتخابات میں دوسری جماعتوں کے مخالف و مقابل کی حیثیت سے شرکت، دعوت و اصلاح کے صحیح نہج کے منافی ہے اور اس سے قبولِ حق کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

داعی کے قلب میں اپنے ابنائے نوع کے لیے جس ہمدردی اور نصح و خیر خواہی

کا ہونا لازمی ہے، اسی کا ایک اہم مظہر رافت و رحمت اور شفقت و رقت کا وہ جذبہ ہے جو ابنائے نوع کو تکلیف اور مصیبت میں دیکھ کر اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور عملی زندگی میں خدمتِ خلق اور ایثار و انفاق کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ دعوتِ دین اور خدمتِ خلق کا ایسا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں بلکہ بلاخوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ دین کا وہ داعی جو خادمِ خلق نہ ہو اپنی دعوت میں دولتِ اخلاص سے محروم ہے۔ اس ضمن میں یہ فرق البتہ ضرور پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ خدمتِ خلق کی اجتماعی سکیموں کو زیرِ عمل لانا بالکل دوسری بات ہے اور افراد میں خدمتِ خلق کے جذبے کا پیدا ہونا اور بڑھنا بالکل دوسری چیز ہے۔ خدمتِ خلق کی اجتماعی سکیموں کی اہمیت اپنی جگہ کتنی ہی مُسلّم ہو، دعوتِ دین کے نقطۂ نظر سے اصل مطلوب افراد کے قلوب میں شفقت و رحمت کے جذبے اور عمل میں ایثار و انفاق کی کیفیت کا ظہور ہے۔ پیشِ نظر اجتماعیت میں اصل زور انشاء اللہ اسی پر دیا جائے گا!

دعوت کے ضمن میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس کا تخاطب لازماً ایک تدریج کے ساتھ داعی کے اپنے نفس سے شروع ہو کر (عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ) اپنے اہل و عیال (قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا) اور کنبے قبیلے (وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ) سے ہوتے ہوئے اپنی قوم (يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ) اور پھر پوری انسانیت (لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ) تک پہنچنا چاہیے۔ ہمارے نزدیک یہ صورت کہ داعی اپنے آپ کو بھول جائے اور برّ و تقویٰ کی ساری دعوت دوسروں کو دیتا رہے (اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ) یا اپنے خاندان اور کنبے قبیلے کو تو بھول جائے اور دُور دراز کے لوگوں میں ہدایت کی سوغات بانٹنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہو، نہایت خطرناک مرض کی علامت ہے۔ دعوت کے عمل کا صحیح نہج یہ ہے کہ اَلْاَقْرَبُ فَالْاَقْرَبُ

کے اُصول پر آگے بڑھے اور جس سے جتنی قربت اور محبت داعی کو ہو دعوت و تخاطب میں اسی قدر اسے مقدم رکھا جائے۔ اس سلسلے میں یہ خیال البتہ صحیح نہ ہوگا کہ ایک مرحلے کی تکمیل کے بعد ہی دوسرا مرحلہ شروع کیا جائے۔ مطلوب صرف یہ ہے کہ دعوت کے عمل کو ایک فطری تدریج اور حسین تناسب کے ساتھ اپنی ذات، اہل و عیال، کنبے قبیلے اور پھر عوام الناس تک بڑھنا چاہیئے۔

اس سلسلے میں ہمیں اپنی اولاد اور فی الجملہ نئی نسل کے بارے میں خصوصی توجہ و اہتمام سے کام لینا ہوگا اس لیے کہ ان کے بارے میں ہم حدیثِ نبویؐ کُلُّکُمْ رَاعٍ وَّکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِیَّتِہٖ ... الخ کی رُو سے براہِ راست مسئول اور ذمہ دار ہیں۔ اولاد کی دینی تعلیم و تربیت کا یہ اہتمام ذاتی و انفرادی بھی ہوگا اور جہاں جہاں ممکن ہوگا اور وسائل دستیاب ہو سکیں گے اس امر کی سعی بھی کی جائے گی کہ ایسے مدارس اپنے اہتمام میں قائم کیے جائیں جن میں نئی نسل کے قلوب و اذہان میں ایمان کی تخم ریزی و آبیاری اور اخلاقی و عملی تربیت کا بندوبست کیا جائے۔

وسائلِ دعوت کے ضمن میں کوئی تعین غیر ضروری ہے۔ حسبِ صلاحیت و استعداد انفرادی و نجی گفتگو، خطاب ہائے عام، خطباتِ جمعہ اور دروسِ قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت کے تمام جدید طریقوں کو اختیار کیا جا سکتا ہے!

قرارداد کا تیسرا اہم نکتہ "عامۃ الناس کو دین کی دعوت و تبلیغ" کی اس ذمہ داری سے بحث کرتا ہے جو "اُمتِ مسلمہ پر بحیثیتِ مجموعی عائد ہوتی ہے"۔ ہمارے نزدیک انذار و تبشیر، دعوت و تبلیغ اور شہادتِ حق علی الناس کی جو ذمہ داریاں انبیائے کرام علیہم السلام پر عائد ہوا کرتی تھیں، وہ اب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت و رسالت کے ختم ہو جانے کے بعد آپ کی اُمت پر بحیثیتِ مجموعی عائد ہوتی ہیں۔ اوّل اوّل اس

اُمّت نے "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کے نظام کے تحت اپنی اس ذمّہ داری کو اجتماعی حیثیت سے ادا کیا۔ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے خاتمے کے بعد بھی ایک عرصے تک مسلمان حکومتیں اس فرضِ منصبی کو ادا کرتی رہیں۔ اس کے بعد ایک طویل عرصے تک اتقیاء و صلحا ذاتی طور پر دُور دراز علاقوں میں پہنچ کر دین کی دعوت و تبلیغ کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ ادھر عرصے سے یہ سلسلہ بھی تقریباً ختم ہو چکا ہے اور اُمّتِ مسلمہ بحیثیتِ مجموعی "کتمانِ حق" کے جرم کی مرتکب ہو رہی ہے اور صورتِ حال یہ ہے کہ اُمّت کی تمام اجتماعی سرگرمیاں صرف اپنے دفاع اور دنیوی ترقی و استحکام تک محدود ہیں۔ کچھ تھوڑا بہت دینی رنگ کسی اجتماعی سرگرمی میں ہے بھی تو وہ محض اُمّت کی داخلی اصلاح کی حد تک ہے۔ ہمارے نزدیک یہ صورتِ حال سخت تشویشناک ہے اور اس سے نہ صرف یہ کہ اُخروی بازپُرس کا اندیشہ ہے، بلکہ ہماری رائے میں ہماری دنیوی نکبت و ذلت کا اصل سبب بھی یہی ہے!

اس ضمن میں ہمارے نزدیک اس وقت کرنے کا اہم ترین کام یہ ہے کہ ایک طرف ادیانِ باطلہ کے مزعومہ عقائد کا مؤثر و مدلّل ابطال کیا جائے اور دوسری طرف مغربی فلسفہ و فکر اور اس کے لائے ہوئے زندقہ و الحاد اور مادّہ پرستی کے سیلاب کا رُخ موڑنے کی کوشش کی جائے اور حکمتِ قرآنی کی روشنی میں ایک ایسی زبردست جوابی علمی تحریک برپا کی جائے جو توحید، معاد اور رسالت کے بنیادی حقائق کی حقانیت کو بھی مبرہن کر دے اور انسانی زندگی کیلئے دین کی رہنمائی و ہدایت کو بھی مدلّل و مفصل واضح کر دے۔ ہمارے نزدیک اسلام کے حلقے میں نئی اقوام کا داخلہ، اور جسدِ دین میں نئے خون کی پیدائش ہی نہیں، خود اسلام کے موجود الوقت حلقہ بگوشوں میں حرارتِ ایمانی کی تازگی اور دین و شریعت کی عملی پابندی اسی کام کے ایک مؤثر حد تک تکمیل پذیر ہونے پر موقوف ہے، اس لیے کہ دَورِ جدید کے گمراہ کن افکار و نظریات کے سیلاب میں خود مسلمانوں کے ذہن

اور تعلیم یافتہ طبقے کی ایک بڑی تعداد اس طرح بہہ نکلی ہے کہ ان کا ایمان بالکل بے جان اور دین سے ان کا تعلق محض برائے نام رہ گیا ہے اور اسی بنا پر دین میں نت نئے فتنے اُٹھ رہے ہیں اور ضلالت و گمراہی نت نئی صورتوں میں ظہور پذیر ہو رہی ہے۔

اس سلسلے میں انفرادی کوششیں تو اب بھی جیسی کچھ بھی عملاً ممکن ہیں جاری ہیں اور آئندہ بھی جاری رہیں گی۔ ضرورت اس کی داعی ہے کہ جیسے بھی ممکن ہو وسائل فراہم کیے جائیں اور ایک ایسے باقاعدہ ادارے کا قیام عمل میں لایا جائے جو حکمتِ قرآنی اور علمِ دینی کی نشر و اشاعت کا کام بھی کرے اور ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا بھی مناسب اور مؤثر بندوبست کرے جو عربی زبان، قرآن حکیم اور شریعتِ اسلامی کا گہرا علم حاصل کر کے اسلامی اعتقادات کی حقانیت کو بھی ثابت کریں اور انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے جو ہدایات اسلام نے دی ہیں انہیں بھی ایسے انداز میں پیش کریں جو موجودہ اذہان کو اپیل کر سکے۔

آخر میں اس امر کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ پیشِ نظر تنظیم ہرگز "الجماعت" کے حکم میں نہ ہوگی۔ الجماعۃ کا مقام ہماری دانست میں اُمتِ مسلمہ کو بحیثیتِ مجموعی حاصل ہے۔ پیشِ نظر اجتماعیت کی حیثیت مسلمانوں کی ایک ایسی تنظیم کی ہوگی جس میں وہ لوگ شریک ہوں گے جو خود اصلاحِ نفس اور تعمیرِ سیرت کے خواہش مند ہوں اور ان جملہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا چاہیں جو دین کی جانب سے ان پر عائد ہوتی ہیں تاکہ ایک طرف اُن کا باہمی تعاون ایک دوسرے کے لیے سہارا بن سکے اور دوسری طرف اصلاحِ معاشرہ کے لیے ایک مؤثر قوت فراہم ہو جائے ——— دین کی خدمت نہایت وسیع و عظیم کام ہے اور اس کے گوشے بے شمار ہیں۔ ہم ان تمام جماعتوں اور اداروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو کسی بھی گوشے میں دین کی خدمت کا کام کر رہے ہیں اور ان شاء اللہ ان کے ساتھ ہمارا رویہ تعاون و تائید ہی کا ہوگا ——— اپنے فہم و فکر کے مطابق ہم بھی دین کی خدمت کی ایک ادنیٰ کوشش کے لیے جمع ہو رہے ہیں اور یہ توقع کرتے ہیں اپنے

آپ کو حق بجانب سمجھتے ہیں کہ دین کے تمام خادم ہمیں اپنے رفیقِ راہ ہی گردانیں گے ـــــ اس تصریح کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ ہم واقعۃً تمام دینی عناصر خصوصاً علمائے کرام کے تعاون کی شدید احتیاج محسوس کرتے ہیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

تقریر مولانا امین احسن اصلاحیؒ

خطبۂ مسنونہ کے بعد،

بھائیو اور دوستو!

ایک طویل مدت کے بعد ہم خیال و ہم مقصد دوستوں کی صحبت جو میسر آئی ہے تو معلوم نہیں دل کے کتنے گوشے ہیں جن کے دریچے کھل گئے ہیں اور کتنے سوئے ہوئے خیالات ہیں جو جاگ پڑے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان ساری باتوں کو ایک صحبت میں کہہ ڈالنا ممکن نہیں ہے۔ یہ تو جب بھی کہی جائیں گی مختلف قسطوں ہی میں کہی جائیں گی۔ اس وقت تو صورتِ حال یہ ہے کہ سر انہیں مل رہا ہے کہ بات کہاں سے شروع کی جائے۔ کیا بات کہی جائے کیا نہ کہی جائے اور شروع کر کے بات کہاں ختم کی جائے۔ اس انجمن کی وجہ سے آپ مجھے اجازت دیجئے کہ میں گفتگو صرف اس قرارداد کی وضاحت تک محدود رکھوں جو اپنے پورے مالہٗ اور ماعلیہ کے ساتھ آپ کے سامنے آچکی ہے۔

اس قرارداد کی وضاحت کرنے میں اس وجہ سے نہیں اٹھا کہ اس میں کوئی ابہام و اجمال ہے۔ یہ اپنے مقصد و مفہوم میں بالکل واضح ہے۔ جس طرح میں نے اس کو سمجھ لیا ہے اسی طرح آپ نے بھی اس کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ میری اس وضاحت کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس میں جو نصبُ العین اور جو طریقۂ کار اپنانے کا ارادہ ظاہر کیا گیا ہے اس کے بعض دلائل آپ کے سامنے عرض کروں تاکہ اس کی پوری اہمیت آپ کے سامنے آجائے۔

ہم نے اس قرارداد میں اللہ کا نام لے کر ایک ایسی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کیا ہے : جو دین کی جانب سے عائد کردہ جُملہ انفرادی و اجتماعی ذمّہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ہماری مدد کرے"۔ — قرارداد کا یہ جُملہ دو اہم حقیقتوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ایک اس حقیقت کی طرف کہ آپ تنظیم کو بجائے خود غایت و مقصد نہیں سمجھتے بلکہ اس کو صرف دین کی عائد کردہ انفرادی و اجتماعی ذمّہ داریوں کے ادا کرنے میں اپنے لیے ممّد و معاون سمجھتے ہیں۔ دوسرے اس بات کی طرف کہ آپ اپنا نصب العین دین کو سمجھتے ہیں۔ اور اس دین کو اپنی انفرادی و اجتماعی دونوں زندگیوں پر حاوی مانتے ہیں۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے وہ درحقیقت ایک بہت بڑے خطرے سے آگاہی ہے۔ وہ خطرہ یہ ہے کہ جماعتیں اور تنظیمیں قائم تو ہوتی ہیں اصلاً کسی اعلیٰ اور برتر نصب العین کے لیے، لیکن قائم ہو جانے کے بعد آہستہ آہستہ وہ خود نصب العین اور مقصد بن جاتی ہیں، اور اصل نصب العین غائب ہو جاتا ہے۔ آپ کو اس خطرے سے ہر قدم پر ہوشیار رہنا ہے۔ اس چیز نے نہ صرف جماعتوں اور تنظیموں کو تباہ کیا ہے، بلکہ ملّتوں اور اُمتوں کو بھی بالکل برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ اس تغیّر کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوتا کہ اصل مقصد غائب ہو جاتا ہے بلکہ مقصد وسیلہ اور ذریعہ کا ایک ادنیٰ خادم اور چاکر بن کے رہ جاتا ہے۔ پھر تنظیم مقصد کی خدمت نہیں کرتی بلکہ مقصد کو اپنی خدمت اور اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتی ہے۔ مذہب کے نام قائم ہونے والی جماعتوں کے لیے یہ چیز خاص طور پر خطرناک ہے، اس لیے کہ جب اس طرح کی کوئی جماعت خود اپنے وجود اور اُس کے قیام و بقا کو مقصود بنا لیتی ہے تو وہ مذہب کی بھی جن چیزوں کو اپنے اس مقصد کی راہ میں مزاحم پاتی ہے، اُن کو بدل کر اپنے جماعتی اغراض کے سانچے میں ڈھال لیتی ہے۔ مذاہب کی تاریخ ایک ساتھ شہادت دیتی ہے کہ اس چیز نے بے شمار تحریفات کی راہیں کھولی ہیں اور اس سے بڑے فتنے ظہور میں آئے ہیں۔ اس خطرے کے پیشِ نظر اس قرارداد میں اس امر کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھا گیا ہے کہ تنظیم بجائے خود غایت و مقصد نہ بننے پائے بلکہ وہ اصل مقصد کے وسیلہ و ذریعہ کی حد تک محدود رہے۔ قرارداد کے اس پہلو پر بہت سی باتیں کہنی ہیں جو آگے کے مراحل میں بتدریج آپ کے سامنے آئیں گی۔ اس کے لیے لازماً اس کے تنظیمی ڈھانچہ میں ایسی

حد بندیاں کرنی پڑیں گی جو اس کو بے راہروی اور گمراہی سے محفوظ رکھیں۔

جہاں تک دوسری چیز یعنی دین ہی کو نصب العین بنانے کا تعلق ہے یہ کم از کم ہمارے اور آپ کے لیے محتاج دلیل نہیں۔ ہم خدا کے فضل سے مسلمان ہیں، اور ہمارا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ انسانیت کی اصل ترقی و فلاح مذہب کے ساتھ وابستہ ہے۔ مذہب کے بغیر انسان بس ایک ترقی یافتہ حیوان ہے، جیسا کہ نظریۂ ارتقاء کے قائلین کہتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ ایک حیوانِ ناطق جیسا کہ ارسطو نے انسان کی تعریف کی ہے۔ ہم ان دونوں میں سے کسی تعریف کو بھی انسان کی صحیح تعریف نہیں سمجھتے۔ ہمارے نزدیک انسان ایک رُوحِ یزدانی کا حامل ہے جیسا کہ قرآن نے "وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي" کے الفاظ سے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے یہی رُوح یزدانی ہے جو انسان کا شرفِ خصوصی ہے اور اسی کی بدولت انسان مسجودِ ملائک بنا ہے۔ یہی رُوحِ ملکوتی اگر انسان کی رُوحِ بہیمی پر غالب رہے تو انسان حقیقی انسان ہے ورنہ وہ بس دو ٹانگوں پر چلنے والا ایک جانور ہے۔ اس رُوحِ ملکوتی کے رُوحِ بہیمی پر غالب رہنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان کے ارادے کی باگ خدا کی شریعت کے ہاتھ میں ہو۔ اگر انسان کا ارادہ شریعت کے ہاتھ میں نہ ہو اور اس کی عقل خدا کی وحی سے رہنمائی حاصل نہ کرے تو جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ کپڑوں میں ملبوس ایک جانور ہے۔ یہ جانور گدھا بھی ہو سکتا ہے، کتا بھی ہو سکتا ہے، اور بندر اور خنزیر اور ایک خوفناک درندہ بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن نے شریعت سے بے قید انسانوں کو مذکورہ تمام جانوروں سے تشبیہ دی ہے۔ یہ تشبیہ محض برائے تشبیہ نہیں ہے بلکہ اظہارِ حقیقت ہے۔ اگر ہمارے پاس حقیقت کو دیکھنے والی آنکھیں ہوں تو ہم اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ ہمارے متمدن شہروں میں کپڑوں میں ملبوس کتنے چوپائے اور درندے انسانوں کے بھیس میں پھر رہے ہیں۔ اور اس صفحۂ ارضی پر قوموں کی قومیں ہیں جو متمدن کہلانے کے باوجود اپنی سرشت کے اعتبار سے درندوں سے زیادہ سفاک اور خونخوار بن گئی ہیں۔

ہمارے لیے شریعت کے انتخاب کا معاملہ بھی کوئی پیچیدہ معاملہ نہیں ہے ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اسلام تمام دنیا کا مشترک دین ہے اور قرآن خدا کی آخری اور کامل کتاب، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری رسول ہیں۔ اس وجہ سے یہ عین ہمارے عقیدے کا تقاضا

ہے کہ ہم اپنی زندگی اسلام کے احکام و ہدایت کے تحت گزاریں اور اسی کی دعوت دوسروں کو بھی دیں۔

یہ دوسروں کو دعوت دینا بھی عین ہماری فطرتِ بشری کا اقتضاء اور ہماری اپنی اصلاح اور ترقی کا لازمہ ہے۔ آپ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتے کہ انسان تنہا نہیں پایا جاتا وہ ایک مدنی الطبع ہستی ہے۔ وہ کسی خاندان کے فرد، کسی قبیلہ کے رکن، کسی شہر کے شہری اور کسی ملک کے باشندے کی حیثیت سے پایا جاتا ہے اور اپنی فطری صلاحیتوں کے پروان چڑھنے کے لیے وہ ان سب باتوں کا محتاج ہے۔ اسی بناء پر انسان کو Social Animal کہا گیا ہے۔ جس طرح مچھلی پانی سے مستغنی نہیں ہو سکتی، اسی طرح انسان معاشرے سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ اگر انسان معاشرہ سے بے تعلق ہو کر اپنی صلاحیتوں کو صحیح طور پر اُجاگر کر سکتا تو اسلام رہبانیت کی ممانعت نہ کرتا۔ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے نباتات میں سے Creepers سے مشابہ ہے۔ جس طرح انگور کی بیل صحیح طور پر اسی طرح پروان چڑھتی ہے جب اس کو کوئی سہارا ملے۔ بغیر اس سہارے کے وہ سکڑ کے رہ جاتی ہے۔ اسی طرح انسان بھی صحیح طور پر اسی طرح پروان چڑھتا ہے جب اس کو معاشرے کا سہارا ملے بغیر اس سہارے کے اس کی صلاحیتیں سکڑ کے رہ جاتی ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی ضروری ہے کہ یہ سہارا اس کے روحانی تقاضوں کے موافق ہو۔ جس طرح انگور کی بیل اس سہارے کے اثرات میں سے حصہ لیتی ہے جس پر وہ چڑھتی ہے، اسی طرح انسان اس معاشرے کے خیر و شر سے متاثر ہوتا ہے، جس میں زندگی گزارتا ہے۔ انگور کی بیل کو نیم پر چڑھا دیجئے تو اس کے پھل کڑوے کسیلے ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح انسان اگر بُرے معاشرے میں زندگی گزارے تو وہ بُرا بن سکتا ہے۔

انسان کی اس فطرت نے اس کے لیے ایک سخت مشکل پیدا کر دی ہے۔ ایک طرف تو اس کی فطرت کی رُو سے یہ واجب ہے کہ وہ اپنے لیے سازگار معاشرہ تلاش کرے اور اگر معاشرہ سازگار نہ ہو تو اپنے روحانی و اخلاقی تقاضوں کے لیے پورے اخلاص کے ساتھ اس کو سازگار بنانے کی جدوجہد کرے۔ اگر کوئی شخص یہ جدوجہد نہ کرے تو اس کی اخلاقی و روحانی موت یقینی ہے۔

اگرچہ کوئی شخص کسی دوسرے کی اصلاح پر اختیار نہیں رکھتا، دوسرے کی اصلاح اللہ کی توفیق پر منحصر ہے لیکن ہر شخص خود اپنی اصلاح کے لیے اس جدوجہد پر اپنے امکان اور اپنی صلاحیتوں کی حد تک مامور ہے۔

اس وجہ سے ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے اس پر واجب ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے اس کی اصلاح کرے، اگر اس کی قدرت رکھتا ہو اگر ہاتھ سے اس کی اصلاح کی قدرت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اس کی اصلاح کی کوشش کرے اگر اس کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اگر اس کی بھی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو ادنیٰ درجہ کا ایمان یہ ہے کہ اس کو دل سے برا جانے (یعنی اس میں کسی نوعیت سے بھی تعاون نہ کرے!) اس سے نیچے ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے۔

معاشرہ سے متعلق افراد کی ذمہ داریوں کو واضح کرنے کے لیے حضورؐ نے معاشرہ اور افراد کو ایک کشتی کے مسافر سے تشبیہ دی ہے۔ ایک کشتی میں کچھ لوگ عرشے پر سفر کرتے ہیں اور کچھ لوگ اس کے نیچے کے حصے میں۔ فرض کیجئے نیچے والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں پانی لینے کے لیے اوپر جانے کی مشقت اٹھانی پڑتی ہے، کیوں نہ ہم اپنے حصے میں کشتی کے پیندے میں سوراخ کرلیں اور اوپر والے یہ خیال کرکے کہ وہ اپنے حصے کی کشتی میں سوراخ کر رہے ہیں ان کو اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش نہ کریں بلکہ سوراخ کرنے کے لیے ان کو آزاد چھوڑ دیں تو سوراخ ہو جانے کے بعد کشتی جو ڈوبے گی تو اوپر والوں اور نیچے والوں سب کو لے کر ڈوبے گی۔ یہی حال معاشرے کا ہے، اس میں اچھے بھی ہوتے ہیں، برے بھی ہوتے ہیں۔ اگر اچھے لوگ معاشرہ کے خیر و شر سے بے تعلق ہو جاتے ہیں تو بروں کی برائی سے جو آفت ظہور میں آتی ہے اس میں اچھے اور برے دونوں ہی حصہ پاتے ہیں۔

حدیثوں میں ایک بستی کا ماجرا بھی بیان ہوا ہے جس سے یہ حقیقت مزید واضح ہوتی ہے۔ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بستی کے متعلق فرشتہ کو حکم دیا کہ جا کر اس کو الٹ دو۔ فرشتہ نے عرض کی کہ باری تعالیٰ اس میں تو تیرا ایک ایسا بندہ بھی ہے جو برابر تیری عبادت میں لگا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کے سمیت بستی کو الٹ دو، اس لیے کہ اس کا چہرہ کبھی میرے دین کی

بے حسی پر غیرت سے تماشا نہیں۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوتی کہ ہمارے لیے اپنے معاشرے کے خیر و شر سے بے تعلق رہنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، نہ ہماری فطرت اس بے تعلقی کی روادار ہے نہ ہمارا مذہب اس کی اجازت دیتا ہے۔ دوسروں کی اصلاح سے قطع نظر ہم خود اپنی اصلاح و فلاح کے لیے اس بات کے محتاج ہیں کہ اپنے معاشرے کو اپنے روحانی و اخلاقی تقاضوں کے لیے سازگار بنانے کی کوشش کریں۔ اس کوشش سے دوسروں کی اصلاح ہو یا نہ ہو، لیکن ہماری اصلاح ہوگی۔ اس سے ہماری اپنی صلاحیتیں پروان چڑھیں گی اور ہماری اپنی فطرت کے مضمرات بروئے کار آئیں گے۔ جو شخص یہ کام کرتا ہے وہ خود اپنا فرض انجام دیتا ہے اور دوسروں سے زیادہ وہ خود اپنے اوپر احسان کرتا ہے۔ اس وجہ سے اگر کوئی شخص یہ فرض انجام دیتا ہے تو اس کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو معاشرہ کا محسن سمجھنے لگے بلکہ وہ یہ سمجھے کہ اس نے اپنا ہی فرض انجام دیا ہے۔ جس طرح ہم نماز پڑھتے ہیں تو کسی پر احسان نہیں کرتے بلکہ خود اپنے اوپر احسان کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہم معاشرہ کی کسی برائی کی اصلاح کرتے ہیں تو کسی پر احسان نہیں کرتے بلکہ صرف اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ دین میں دوسروں کے نیک و بد سے متعلق ہم پر جو ذمہ داری عائد کی گئی ہے وہ ہمارے ذاتی فرض ہی کی حیثیت سے عائد کی گئی ہے۔

زیر بحث قرار داد میں یہ تصور اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے اور اس کے دو بڑے اہم فائدے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ کوئی شخص دعوت و اصلاح کا کوئی کام کرتے ہوئے یہ نہیں سمجھے گا کہ وہ کسی دوسرے کا کام کر رہا ہے، بلکہ وہ یہی سمجھے گا کہ اپنا ہی کام کر رہا ہے۔ دوسرا یہ کہ کوئی شخص دوسروں کی اصلاح میں اتنا مستغرق نہیں ہوگا کہ وہ خود اپنی اصلاح سے غافل اور بے پروا ہو جائے۔ یاد رکھیے کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ دوسروں کی اصلاح کی کوشش اصلاً خود اپنی ہی اصلاح کی کوشش کا ایک حصہ ہے جو شخص دوسروں کی اصلاح میں رات دن سرگرم رہتا ہے لیکن اسے خود اپنی اصلاح کی فکر نہیں ہے، وہ محض نمائشی مصلح ہے۔ جو خود بھٹک رہا ہو وہ دوسروں کی رہبری نہیں کر سکتا۔ انگور کی وہ بیل سوکھ جاتی ہے جس کی اپنی جڑ اکھڑی ہوتی ہو، اگرچہ اس کو کتنے ہی خوبصورت سہارے پر چڑھا دیجئے۔ اس زمانے میں چونکہ زیادہ تر مدعیان اصلاح ایسے ہی ہیں جنہیں

خود اپنے دین و ایمان کا کچھ ہوش نہیں لیکن دوسروں میں دین کی سوغات بانٹنے کے لیے خشکی و تری کا سفر کرتے پھرتے ہیں، اس وجہ سے ضروری ہے کہ اصل نقطہ پر لوگوں کی توجہ مرکوز کرائی جائے۔ چنانچہ قرارداد میں اِس حقیقت کو یوں واضح کیا گیا ہے کہ "ہمارے نزدیک دین کا اصل مخاطب فرد ہے۔ اُسی کی اخلاقی و روحانی تکمیل اور فلاح و نجات دین کا اصل موضوع ہے اور پیشِ نظر اجتماعیت اصلاً اسی لیے مطلوب ہے کہ وہ فرد کو اس کے نصب العین یعنی رضائے الٰہی کے حصول میں مدد دے۔"

اس تصور کا قدرتی مطالبہ یہ ہے کہ اس تنظیم کا ڈھانچہ ایسا بنایا جائے کہ وہ اپنے اعضاء و ارکان کی اصلاح و تربیت کا ایک جامع ادارہ بن جائے۔ اس عزم کا اظہار قرارداد میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

"لہٰذا پیشِ نظر اجتماعیت کی نوعیت ایسی ہونی چاہیے کہ اس میں فرد کی دینی و اخلاقی تربیت کا کما حقہٗ لحاظ رکھا جائے اور اس امر کا خصوصی اہتمام کیا جائے کہ اس کے تمام شرکاء کے دینی جذبات کو جِلا حاصل ہو، ان کے علم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے، ان کے عقائد کی تصحیح و تطہیر ہو، عبادات اور اتباعِ سنت سے اُن کا ذوق و شوق بڑھتا چلا جائے، عملی زندگی میں حرام و حلال کے بارے میں ان کی حِس تیز اور اُن کا عمل زیادہ سے زیادہ مبنی بر تقویٰ ہوتا چلا جائے اور دین کی دعوت و اشاعت اور اس کی نصرت و اقامت کے لیے اُن کا جذبہ ترقی کرتا چلا جائے۔"

اِن تمام مقاصد کے حصول کے لیے تنظیم کیا وسائل و ذرائع اختیار کرے گی؟ اس کا جواب دینا بروقت میرے لیے مشکل ہے۔ اِس کا جواب بہت کچھ منحصر ہے اس بات پر کہ اس تنظیم کو کن صلاحیتوں کے افراد حاصل ہوتے ہیں اور وہ اپنی مجموعی کوشش سے کیا اسباب و وسائل فراہم کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔ افراد اور وسائل کی وسعت کے ساتھ ساتھ امکانات کا جائزہ لینا، اور ان کے مطابق قدم اٹھانا تنظیم کے اربابِ حل و عقد کا کام ہے لیکن اتنی بات بدیہی ہے کہ اس مقصد کے بروئے کار لانے میں اس امر کی پوری کوشش کی جائے گی کہ جو قدم بھی اُٹھے اُسوۂ انبیاء کی روشنی میں اُٹھے، اور جماعت کی تربیت اس نہج پر ہو جس کی طرف کتاب و سنت میں رہنمائی کی گئی ہے۔

ہم اپنی تربیت کے لیے سب سے پہلے تو صحیح علم کے محتاج ہیں۔ صحیح علم سے میری مراد دین کا علم ہے۔ اس زمانے میں دین کا علم عنقا ہو رہا ہے، اس کے حصول کے لیے وسائل و ذرائع

بھی روز بروز کم سے کم تر ہوتے جا رہے ہیں اور لوگوں کے اندر اس کی رغبت بھی بالکل ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اگر دین کا علم ہی مٹ گیا تو پھر دین کے باقی رہنے کا کیا امکان ہے؟ یہ امر بھی بدیہی ہے کہ اس زمانے میں دین کا روایتی علم بالکل غیر مفید ہے۔ یہ زمانہ عقلیت کا زمانہ ہے، اس زمانے میں لوگ ہر چیز کی دلیل و محبت کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ مجرد یہ بات لوگوں کو اپیل نہیں کرتی کہ فلاں بات دین کی بات ہے۔ دین پر آج جو اعتراضات ہو رہے ہیں، وہ کل کے اعتراضات سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ اعتراضات جدید مغربی فکر و فلسفہ کی پیداوار ہیں اور ان کو زور و قوت کے ساتھ پھیلانے والے خود ہمارے اندر پیدا ہو گئے ہیں۔ جب تک ان اعتراضات و شبہات کا مؤثر ازالہ نہ ہو اس وقت تک ممکن نہیں ہے کہ آپ دین کی کوئی مفید خدمت انجام دے سکیں۔ افسوس ہے کہ اس خدمت کی صلاحیت رکھنے والے آج ہمارے اندر اگر مفقود نہیں تو اتنے کم ہیں کہ وہ دین کے محاذ کو کسی طرح بھی سنبھال نہیں سکتے۔ اس وجہ سے وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایسے حاملانِ دین پیدا کرنے کی مؤثر جدوجہد کی جائے جو جدید علوم و افکار سے بھی کماحقہٗ آگاہ ہوں اور کتاب و سنت کے دلائل و براہین پر بھی وہ براہِ راست نظر رکھتے ہوں۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ ہمارا دین دنیا میں بے دلیل نہیں آیا ہے۔ وہ بہتر سے بہتر فطری و عقلی دلائل سے مسلح ہو کر آیا ہے، جو ہر دور کے فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی ہیں، بشرطیکہ ان کو اُجاگر کرنے والے اور ان کو دنیا کے سامنے حالات کے مطابق پیش کرنے والے موجود ہوں۔ دوستو! یہ کام کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس قسم کے افراد صرف اردو میں لکھی ہوئی چند کتابیں پڑھ لینے سے نہیں پیدا ہوں گے، بلکہ اس کے لیے کتاب و سنت اور علومِ اسلامیہ سے براہِ راست گہری واقفیت ضروری ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس قسم کی صلاحیت ہم میں سے ہر شخص اپنے اندر نہیں پیدا کر سکتا۔ لیکن معتدبہ تعداد ہمارے اندر جب تک ایسے لوگوں کی نہ ہو گی ہم ان ذمہ داریوں سے کماحقہٗ عہدہ برآ نہ ہو سکیں گے جو دین سے متعلق اس زمانے میں ہم پر عائد ہوتی ہیں۔

جہاں تک عامۃ المسلمین کو دین کی دعوت دینے کا تعلق ہے اس کے بارے میں مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ اس زمانے میں مجرد تذکیر کافی نہیں ہے، بلکہ وسیع پیمانے پر تعلیم و تفہیم

کی ضرورت ہے۔ یہ صورت نہیں ہے کہ لوگ دین کی باتیں بھولے ہوئے ہیں، اگر انہیں یاد دلا دی جائیں تو وہ ان کو اختیار کر لیں گے، بلکہ اشاعتِ باطل کے وسیع ذرائع نے اس زمانے میں عام اذہان کے اندر بھی دین اور دینی احکام سے متعلق بے شمار غلط فہمیاں بھر دی ہیں جن کو دُور کرنے کا سامان کرنا ان لوگوں پر واجب ہے جو آج ملک کے عوام کی اس پہلو سے کوئی خدمت کرنا چاہتے ہوں۔ آج اخبارات گھر گھر پہنچ رہے ہیں۔ ریڈیو کھیتوں اور کھلیانوں تک موجود ہے۔ اس وجہ سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ زندگی کے جدید شیطانی نظریات سے ہمارے عوام بے خبر ہیں یا وہ ان سے بالکل بے تعلق ہیں۔ ان سے تأثر کے معاملے میں شہری اور دیہاتی آبادی میں کچھ فرق ہونا تو ایک قدرتی امر ہے لیکن دیہاتی آبادی کو ان فتنوں سے بالکل الگ تھلگ خیال کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس وجہ سے ان کے اندر کام کرنے کے وہ طریقے اختیار کرنے ہوں گے جو موجودہ حالات میں اُن کے لیے مؤثر اور مفید ہوں۔

جہاں تک ملک کے اربابِ اقتدار کا تعلق ہے اُن کے بارے میں بھی ہمارے ہاں سخت افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو اُن کی اصلاح کے معاملے میں بالکل بے تعلق ہیں، انہیں اُن کے خیر و شر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو اُن کے شر کو بھی خیر ہی کہنا پسند کرتے ہیں۔ تیسرے وہ لوگ ہیں جو اُن کے خیر کو بھی شر قرار دیتے ہیں۔ اور ہر حالت میں ان کی مخالفت کرنا اُن کے ہاں جزوِ ایمان ہے۔

آپ کی یہ قرار داد ان تینوں طریقوں کو غلط قرار دیتی ہے اور دین کی روشنی میں ایک چوتھا طریقہ آپ کے سامنے پیش کرتی ہے۔ جہاں تک پہلے طریقے یعنی لاتعلقی کے رویّہ کا تعلق ہے اس کے بارے میں تفصیل کے ساتھ میں عرض کر چکا ہوں کہ اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ کوئی پرایا جھگڑا نہیں ہے جس سے علیحدہ رہنے میں آدمی کے لیے سعادت ہو بلکہ ہم میں سے ہر شخص کے اپنے دین و ایمان کا معاملہ ہے۔ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح تعلیمات کی روشنی میں بتا چکا ہوں کہ جو شخص معاشرہ کے خیر و شر سے بے پروا ہے وہ خود اپنے دین و ایمان سے بے پروا ہے۔ اور اُس کی یہ بے پروائی اُس کی ساری دینداری غارت کر کے رکھ دے گی۔ ہم جس کشتی پر سوار ہیں اپنے امکان کی حد تک کسی کو اس کے پیندے میں سوراخ کرتے ایک

تماشائی کی طرح نہیں دیکھ سکتے۔

دوسرے گروہ کا رویہ بھی بالکل غلط ہے۔ جو چیز غلط ہے اگر وہ اربابِ اقتدار کی طرف سے ظہور میں آئے تو اُس کی غلطی اور بھی سنگین ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ اس کے اثرات بہت دُور رس ہوں گے۔ اگر کوئی شخص اس غلطی کو صواب قرار دے تو یہ اُس پر خاموش رہنے سے بھی بڑا جرم ہے۔ یہ رویہ اگر خوف یا طمع کی بنا پر اختیار کیا جائے تو اسلام میں صریح نفاق ہے، جو ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا۔ اور اگر یہ اس بنیاد پر اختیار کیا جائے کہ اس سے حکومت کو ضعف پہنچتا ہے تو یہ بھی غلط ہے۔ اوّل تو حکومت کو ضعف پہنچ سکتا ہے تو غلط چیز سے نہ کہ صحیح چیز سے، ثانیاً حکومت بجائے خود مقصد و غایت نہیں ہے، بلکہ اسلام میں وہ اللہ کے قانونِ عدل و قسط کا ذریعہ ہے۔ اس وجہ سے حکومت کی مصلحت کے لیے بھی کسی شر کو خیر قرار دینا اپنے دین و ایمان پر کلہاڑی مارنا ہے۔

تیسرے گروہ کا رویہ بھی بالکل غلط ہے۔ اربابِ اقتدار کی ہر بات کو ہدفِ تنقید بنا لینا یہاں تک کہ اُن کے خیر کو بھی شر قرار دینا اور اُس کی مخالفت میں اِس حد تک بڑھ جانا کہ دوسروں کی بُرائیاں بھی اُن کے کھاتے میں ڈال دینا نہ عقل و منطق کی رُو سے جائز ہے، نہ اسلام کی رُو سے۔ یہ اقتدار کی ہوس میں اندھے ہو جانے کی علامت ہے، اور اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی صحیح بات بھی اربابِ اقتدار کو اپیل نہیں کرتی۔ جن کی ذہنیت یہ بن جاتی ہے وہ خیر خواہی کے جذبے سے بالکل خالی ہو جاتے ہیں۔ درانحالیکہ یہ جذبہ دعوتِ دین کی اصل رُوح ہے۔ اگر انسان خیر خواہی کے جذبے سے خالی ہو تو اُس کی ہر بات نفرت اور عناد کی تخم ریزی کرتی ہے اور اگر وہ اس کے ساتھ دین کا نام لیتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ دین کو بھی لوگوں کی نگاہوں میں ایک نفرت انگیز چیز بنانا چاہتا ہے۔ ایسے لوگوں کے ہاتھوں دین کو جو نقصان پہنچا ہے، وہ دین کے کھلے ہوئے دشمنوں کے ہاتھوں بھی نہیں پہنچا ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ اپنی ایک نفسیاتی جنگ میں دین کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور اس طرح بلاوجہ دین کو ان تمام لوگوں کے سامنے ایک حریف بنا کر کھڑا کر دیتے ہیں، جن سے ان کی لڑائی ہوتی ہے۔ مَیں نے دیکھا ہے کہ اس طرح کے لوگ انسانیت اور خلق کی محبت سے بالکل عاری ہوتے ہیں۔ یہ لوگ دل سے اِس بات کے آرزومند ہوتے ہیں کہ ملک میں زلزلے

آئیں، قحط پڑے، سیلاب آئیں، وبائیں پھیلیں تاکہ یہ ان سب چیزوں کا ذمہ دار حکومت کو ٹھہرا کر اپنے اقتدار کے لیے راہ ہموار کریں۔ ایسے بے درد اور سنگ دل لوگوں سے یہ توقع رکھنا کہ یہ دین کی کوئی خدمت انجام دے سکیں گے، محض خام خیالی ہے۔

آپ نے جو قرار داد پاس کی ہے اُس میں آپ نے ان تمام طریقوں سے الگ اپنے لیے "الدین النصیحة" کی راہ اختیار کی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ لوگوں کے خیر و شر سے بے نیاز نہیں ہو سکتے، اس لیے کہ یہ خیر خواہی کے خلاف ہے۔ اسی طرح آپ کسی کے شر کو خیر بھی نہیں کہہ سکتے، اس لیے کہ یہ بھی حق اور خیر خواہی کے خلاف ہے۔ علیٰ ہذا القیاس آپ کسی کی مخالفت کے جوش میں اس کی نیکی کو بدی نہیں ٹھہرا سکتے، اس لیے کہ یہ بھی سچائی اور خیر خواہی کے خلاف ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ دین کو ہوسِ اقتدار کی جنگ میں ایک ہتھیار کے طور پر کبھی استعمال نہیں کریں گے۔ بلکہ جس کے سامنے بھی اس کو پیش کریں گے، اللہ کے دین کی حیثیت سے پیش کریں گے، کہ اسی میں اُس کی بھی بھلائی ہے اور اسی میں آپ کی بھی بھلائی ہے۔ یہی حضرات انبیاء علیہم السلام کا طریق کار ہے اور یہی آپ کو اختیار کرنا ہے۔

رفیقو! میں سمجھتا ہوں کہ ایک واضح چیز کی وضاحت کرنے میں آپ کا بہت سا وقت میں نے لیا۔ اب میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں اور اپنے لیے اور آپ کے لیے دُعا کرتا ہوں کہ ہم نے جو کچھ طے کیا ہے، اس پر ہم عمل کرنے کی توفیق پائیں۔

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ!

عن تمیم الداری رضی اللہ عنہ

انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال:

اِنَّ الدِّیْنَ النَّصِیْحَةُ،

قُلْنَا: لِمَنْ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟

قال: لِلّٰهِ، وَلِكِتَابِهٖ، وَلِرَسُوْلِهٖ،

وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِیْنَ، وَعَامَّتِهِمْ۔ (رواہ مسلم)

تقریر مولانا عبدالغفار حسن

حمد و ثنا کے بعد

رفقائے محترم!

صبح کے درسِ قرآن، پھر قرارداد اور اس کی توضیح اور سب سے بڑھ کر مولانا اصلاحی کی تقریر سے معاملے کے اکثر پہلو اچھی طرح واضح ہو چکے ہیں اور اب میری تقریر کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی، تاہم جو خدمت میرے سپرد ہے میں اس کی انجام دہی میں بعض باتیں آپ حضرات کے سامنے رکھتا ہوں تکرار سے بھی کم از کم تذکیر کا فائدہ تو حاصل ہو ہی جائے گا۔

ایک نئی دینی جماعت کے قیام کے فیصلے پر سب سے پہلے جو سوال ذہنوں میں پیدا ہونا لازمی ہے وہ یہ ہے کہ آخر ایک نئی جماعت کی ضرورت کیا ہے؟ اوّلاً کیا انفرادی طور پر کام کرنا کافی نہیں ہے؟ ثانیاً اگر اجتماعیت لازمی ہے تو بھی ڈیڑھ اینٹ کی ایک نئی مسجد الگ بنانے کی کیا حاجت ہے؟ بہت سی دینی تنظیمیں اور جماعتیں موجود ہیں، کیوں نہ ان میں سے کسی کے ساتھ شامل ہو کر کام کیا جائے؟

جہاں تک اجتماعیت کی ضرورت و اہمیت کا تعلق ہے اس پر مولانا اصلاحی بہت مفصل روشنی ڈال چکے ہیں۔ یہ بدیہی بات ہے کہ بہت سے لوگوں کے علیحدہ علیحدہ کام کرنے اور ان سب کے مل کر اجتماعی طور پر کام کرنے میں نتائج کے اعتبار سے زمین آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ اجتماعیت میں ہر فرد ایک دوسرے کا سہارا اور ایک دوسرے کی کمی پورا کرنے والا ہوتا ہے جس سے کام میں عظیم برکت پیدا ہوتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اللہ نے مختلف لوگوں کو مختلف صلاحیتیں دی ہیں۔ کسی کو بولنے کی صلاحیت دی ہے، کسی کو لکھنے کی، کسی کو بھاگ دوڑ کی قوت دی ہے، کسی کو غور و فکر اور تدبر و تفکر کی اسی طرح کسی کو علومِ دینی سے سرفراز فرمایا ہے اور کسی کو معلوماتِ دنیوی سے بہرہ ور فرمایا ہے۔ کسی کو فہمِ قرآن کے بحرِ عمیق میں غوطے لگانے کی صلاحیت دی ہے تو کسی کو علومِ حدیث کی وسعتوں میں پیراکی کی صلاحیت سے نوازا ہے۔

کسی کو قدیم کی واقفیت عطا فرمائی ہے تو کسی کو جدید سے روشناس کیا ہے مختلف صلاحیتوں اور قوتوں سے مسلح افراد کے مجتمع اور متحد ہو کر کام کرنے سے ہی اس بات کی توقع کی جا سکتی ہے کہ کوئی جامع اور ہمہ گیر نوعیت کا کام سرانجام پا سکے پھر دین و مذہب کے مخالف اور لادینیت کے علمبرداروں کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ پوری طرح منظم ہو کر کام کر رہے ہیں اور ان کے مختلف گروہ اور جتھے مختلف اطراف سے پوری تنظیم اور اجتماعیت کے ساتھ دینی قوتوں پر یلغار کر رہے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اجتماعیت کا مقابلہ انفرادیت سے نہیں کیا جا سکتا اس کے لیے اجتماعیت ہی کی ضرورت ہے۔ بنابریں دینی قوتوں کا منظم و مجتمع ہونا ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

بلاشبہ جماعت سازی سے کچھ اندیشے بھی لاحق ہوتے ہیں مثلاً ایک یہ کہ اس سے جماعتی و گروہی عصبیت، پھر تعصب اور بالآخر تحزب و تفرق کی لعنت وجود میں آتی ہے۔ دوسرے یہ کہ جماعتیں بالعموم شخصیتوں کے گرد گھومتی ہیں اور ان سے شخصیت پرستی کی مہلک بیماری پیدا ہوتی ہے۔ تیسرے یہ کہ خود جماعتیں عموماً داخلی انتشار کا شکار ہو جاتی ہیں اور بعض اوقات اس سے انتہائی کریہہ صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔

اس سلسلے میں اولین بات تو یہ ہے کہ ہر چیز کے مجموعی فائدے یا نقصان کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ بہت سے اچھے کاموں میں کوئی پہلو برائی کا ہو سکتا ہے اور بہت سی برائیوں میں کوئی پہلو اچھائی کا ہونا ممکن ہے۔ قرآن مجید نے خود شراب اور جوئے کے بارے میں بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ ان میں منفعت بھی ممکن ہے لیکن وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ان کا شر ان کی منفعت سے زیادہ ہے اس سے معلوم ہوا کہ جس چیز میں خیر کا پہلو غالب ہو اس کو اختیار کرنا چاہیے اور اس کے شر سے بچاؤ کی ہر ممکن تدبیر کرنی چاہیے۔

شخصیت پرستی کی لعنت کے پیدا ہونے کے امکانات وہاں زیادہ ہوتے ہیں جہاں کسی ایک داعی کی دعوت پر لوگ جمع ہوں اور اسی کے خیالات و نظریات و تصورات اور اسی کے فہم و فکر کو اس اجتماعیت میں مرکز و محور کی حیثیت حاصل ہو جائے۔ اس کے برعکس اگر ابتدا سے بہت سے لوگ باہمی مشاورت سے اپنے مقصد اور اس کے حصول کے طریق کو طے کریں اور

مسلسل "اَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ" کی قرآنی ہدایت پر عمل پیرا رہیں تو ان شاء اللہ اس لعنت کا سدِباب ہو جائے گا۔

"تحزب اور تفرق" سے بچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ دین کی خدمت کے لیے جمع ہونے والے لوگ ہمیشہ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ہی کو اپنا واقعی شعار بنائیں اور اپنے آپ کو اُمتِ مسلمہ ہی کا ایک حصّہ تصور کریں۔ چنانچہ ان میں کوئی غرور و گھمنڈ پیدا ہو نہ اپنے "چیزے دگر" ہونے کا احساس پیدا ہونے پائے اور نہ ہی وہ اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے کسی اعتبار سے بہتر و برتر تصور کریں۔

یہاں یہ حقیقت بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ تحزب اور تفرق محض جماعت سازی ہی سے پیدا نہیں ہوتے بلکہ کوئی ادارہ یا محض درس گاہ یا دارالعلوم بھی ان کا سبب بن سکتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ بنا ہے اور اس کی مثالیں خود ہمارے ملک میں موجود ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جو درسگاہ نئی قائم ہوتی ہے وہ بالعموم کسی ایک خصوصیت کی حامل ہوتی ہے۔ نتیجۃً اس سے فارغ ہونے والے نوجوانوں کا مزاج ایک خاص رنگ میں ڈھلنا شروع ہو جاتا ہے اور مرورِ ایام کے ساتھ اس کے فارغین و متوسلین میں گروہی و حزبی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اب نہ تو یہ صحیح ہے کہ ان خدشات کی بنا پر درس گاہیں اور دارالعلوم قائم کرنے بند کر دیئے جائیں اور نہ یہ صحیح ہے کہ دینی مقاصد کے حصول کے لیے ادارے یا جماعتیں قائم کرنا ممنوع قرار دے دیا جائے۔ اس کے برعکس دارالعلوموں اور اداروں کے قیام کے ساتھ حتی الامکان ایسی احتیاطی تدابیر اختیار کی جانی چاہئیں کہ ان کے ذریعے اُمت میں تفرقہ و انتشار پیدا نہ ہو۔ اس سلسلے میں جس قدر میں نے غور کیا ہے میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایک تو جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے لوگوں میں کچھ "چیزے دگر" ہونے کے احساس کو پیدا ہونے سے روکا جائے اور "اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ" کی قرآنی ہدایت کو ہمیشہ مستحضر رکھا جائے اور دوسرے یہ احتیاط کی جائے کہ عملاً جمعہ و جماعت اور ربط و ضبط اور رشتوں ناطوں کے معاملات کو صرف ہم خیال لوگوں کے حلقے میں محدود کرنے کا رُجحان نہ پیدا ہو ـــــ ان تدابیر پر اگر عمل کیا جائے تو میری رائے میں کوئی دینی جماعت فرقے میں تبدیل نہیں ہوگی ـــــ واللہ اعلم!

تیسرا اندیشہ جماعتوں کے "داخلی انتشار" کا ہے تو اگرچہ ماضی کے کچھ تلخ تجربات کی روشنی میں واقعۃً اس اندیشے سے طبیعت میں بہت زیادہ توحش پیدا ہوتا ہے تاہم یہ حقیقت بادنیٰ تامل سامنے آجاتی ہے کہ محض اس اندیشے کی بنا پر اجتماعی جدوجہد سے باز رہنا ہرگز ایک معقول بات نہیں ہے۔ اختلاف اس عالمِ واقعہ کی ایک عظیم (اگرچہ تلخ) حقیقت ہے "—— وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ" تحریکیں اٹھتی ہیں اور بہت کچھ مفید کام کرتی ہیں پھر ان میں داخلی انتشار رُونما ہو جاتا ہے تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ آپ اپنے خنجر سے خودکشی کرلیتی ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ ان کا کام نسیاً منسیاً ہو جاتا ہے ان کے اثرات ان کے بہت بعد تک بھی باقی رہتے ہیں —— لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ خلوص اور للٰہیت کے ساتھ کام شروع کیا جائے۔ اختلافات کے حل کے لیے صحت مند راستے حتی الامکان کھلے رکھے جائیں۔ اس کے بعد بھی کبھی ناگوار صورتِ حال پیدا ہو تو اس کا سامنا کیا جائے۔

اب دوسرے سوال کو لیجئے —— یعنی یہ کہ آخر ایک نئی جماعت کا قیام ہی کیوں ضروری ہے؟ کیوں نہ موجود الوقت دینی جماعتوں میں سے کسی کے ساتھ مل کر کام کیا جائے؟

اس سوال کا سادہ سا جواب تو یہ ہے کہ جس طرح ملک میں بہت سی درس گاہوں اور دارالعلوموں کے وجود سے یہ لازم نہیں آتا کہ کوئی نئی درس گاہ قائم نہ کی جائے' اسی طرح بہت سی دینی جماعتوں کا وجود کسی نئی جماعت کے قیام کی نفی نہیں کرتا اور جس طرح ایک نئے دارالعلوم کے متوسلین کے بارے میں لازماً یہ نہیں سمجھا جاتا کہ ان کی رائے بقیہ درس گاہوں کے بارے میں بہت بُری ہے' اس طرح ایک نئی دینی جماعت کے متوسلین کے بارے میں یہ سمجھنا کہ یہ لازماً دوسری دینی جماعتوں کے بارے میں بہت بُری یا حقارت آمیز رائے رکھتے ہیں درست نہیں ہے۔

مزید وضاحت کے لیے عرض ہے کہ اس وقت جو جماعتیں ملک میں بالفعل موجود ہیں ہمارے نقطۂ نظر سے ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جن سے ہمیں کلی اختلاف ہے یعنی ان کے طریقِ کار اور ان کے مزاج اور ذہن کو ہم درست نہیں سمجھتے۔ ایسی جماعتوں میں مدغم ہونے یا ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا —— دوسری جماعتیں ایسی ہیں

جو ہماری راستے میں بعض کام بہت اچھے سرانجام دے رہی ہیں لیکن ان کے کاموں میں کچھ خلا ہے اور دین کے بعض تقاضے اس کے ذریعے پورے نہیں ہو رہے ہیں ——— ایسی جماعتوں کے ساتھ دو طرح کا معاملہ نظری اعتبار سے ممکن ہے۔ ایک یہ کہ ان کے ساتھ شامل ہو کر کام کیا جائے اور ان کے اندر رہ کر زور ڈالا جائے کہ دین کے دوسرے تقاضوں کو بھی پورا کیا جائے۔ یہ طریق بظاہر بڑا معقول اور مستحسن نظر آتا ہے لیکن عملاً اپنے اندر بہت سی پیچیدگیاں رکھتا ہے۔ ہر جماعت کے مؤسسین کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے اور ان کے ذہن کی ایک خاص ساخت ہوتی ہے جسے بآسانی بدلا نہیں جا سکتا، اور اگر بدلنے کی کوشش کی جائے تو اس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو سکتا کہ خواہ مخواہ کی کھینچ تان اور بدمزگی پیدا ہو اور ہاتھ کچھ نہ آئے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر ان کے نزدیک کوئی دوسرا پہلو اہم تر ہے تو وہ آپ کی وجہ سے کسی اور پہلو پر کیوں زیادہ زور دیں لہٰذا عملاً دوسرا طریق ہی ممکن العمل بھی ہے اور بہتر بھی یعنی یہ کہ دوسرے لوگ ایک علیحدہ اجتماعیت قائم کریں اور اپنے ذہن و فکر اور اپنی صوابدید کے مطابق کام کریں ——— اب اگر خلوص اور للّٰہیت موجود ہے تو یہ دونوں کام ایک دوسرے کے معاون اور ایک دوسرے کی کمی کو پورا کرنے والے بن جائیں گے اور اگر اخلاص کی دولت ہی سے تہی دامنی ہو تو پھر بھی زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ جیسا تصادم اندر تھا ویسا ہی باہر بھی ہوگا۔ اس صورت میں بھی علیحدہ جماعت سازی پہلی صورت کے مقابلے میں زیادہ نقصان دہ تو کسی طرح نہیں ہو سکتی ———!

اب میں آپ کے سامنے اس نئی دینی تنظیم کے کچھ خصائص پیش کروں گا جس کے قیام کے لیے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ ان کا تذکرہ قرارداد میں بھی ہے اور ان کی توضیحات میں بھی۔ پھر مولانا اصلاحی بھی اپنی تقریر میں ان میں سے بعض کی وضاحت کر چکے ہیں۔ میں ان کو سلسلہ وار پیش کرتا ہوں تاکہ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا کم از کم تذکیر ہو جائے:

پہلی خصوصیت ہماری پیش نظر تنظیم کی یہ ہے کہ اس میں نصب العین کے مقام پر صرف نجات اور رضائے الٰہی کے حصول کو رکھا گیا ہے اور اس میں ایسی کوئی تفریق نہیں رکھی گئی کہ دنیا میں ہمارا مقصود یہ ہے اور آخرت میں یہ! ——— دنیا دار العمل ہے اور آخرت دارِ جزا۔ دنیا میں انسان دین و شریعت کے جملہ تقاضوں کو اُخروی جزا ہی کے لیے پورا کرتا ہے لہٰذا

ہر آن اور ہر لمحہ ہمارا نصب العین ایک ہی ہے اور وہ ہے آخرت کی کامیابی!! اور اس کے لیے دین کے جملہ انفرادی و اجتماعی تقاضوں کو اسی ترتیب و تدریج اور تقدیم و تاخیر کے ساتھ پورا کرنا ضروری ہے جو خود نظامِ دین میں متعین ہے! ان میں سے کسی ایک تقاضے کو اہمیت دے کر 'نصب العین' کے مقام پر لے آنا ہرگز صحیح نہیں ہے!

دوسری خصوصیت ہماری اس تنظیم کی یہ ہوگی کہ ہماری دعوت صرف اللہ اور اس کے دین کی طرف ہوگی نہ کسی خاص شخصیت یا جماعت کی طرف ہوگی نہ کسی خاص مسلک یا فقہی مذہب کی طرف!

اسی بنا پر اس اجتماعیت کی تیسری خصوصیت یہ ہوگی کہ یہ نہ کسی فرد یا گروہ کی حلیف ہو گی نہ حریف۔ اس میں حُب اور بغض اور محبت و نفرت کا معیار صرف اللہ اور اس کا دین ہوں گے اور یہ "کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ" کے قرآنی حکم پر عمل پیرا ہونے کی مقدور بھر سعی کرے گی اور حتی الامکان کوشش کرے گی کہ ذاتی یا گروہی عصبیت یا تعصب کی بنا پر عدل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ۔ چنانچہ ہمارے لیے کسی حزبِ اختلاف کا تصور خارج از بحث ہوگا ـــــ مغربی جمہوریت کے پیدا کردہ ان تصورات سے عدل و انصاف کے تقاضے پامال ہو جاتے ہیں اور انسان اپنی جماعت کے بُرے سے بُرے کام کی حمایت اور حزبِ مخالف کے اچھے سے اچھے کام کی مخالفت پر مجبور ہو جاتا ہے پیشِ نظر اسلامی تنظیم انشاء اللہ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ کے قرآنی احکامات پر عمل پیرا ہوگی۔

چوتھی خصوصیت ہماری اس اسلامی تنظیم کی یہ ہوگی کہ یہ طبقاتی تصور اور اس سے پیدا شدہ تنازع للبقا کے بجائے وحدتِ آدم اور توافق یا تعاون للبقا کے تصور کو اجاگر کرنے کی کوشش کرے گی۔

پانچویں خصوصیت دینی مسائل اور ان سے متعلق اختلافِ مذاہب و مسالک کے متعلق ہے۔ ہمارے نزدیک جملہ دینی مسائل تین طرح کے ہیں۔ ایک وہ جو اساسی اور بنیادی بھی ہیں اور متفق

علیہ بھی، دوسرے وہ جو متفق علیہ تو ہیں لیکن اساسی نہیں ہیں۔ اور تیسرے وہ مسائل ہیں جن میں سلف اور خیر القرون ہی سے اختلاف چلا آرہا ہے۔ ہماری یہ تنظیم ان شاء اللہ اپنی اصل توجہ کا مرکز و محور پہلی قسم کے مسائل ہی کو بنائے گی۔ اس لیے بھی کہ فی الواقع وہی اساسی اور بنیادی ہیں اور اس لیے بھی کہ موجودہ دور کے فتنوں کی زد دراصل ان ہی پر پڑ رہی ہے، یعنی ایمان باللہ، ایمان بالرسالت، اور ایمان بالآخرت ہی خطرے میں پڑ گئے ہیں لہٰذا اس وقت اصل ضرورت ان کے استحکام کی ہے، اور ان کے معاملے میں کسی قسم کی رواداری اور مداہنت کا کوئی امکان نہیں ہے۔ دعوت میں نرمی اور حکمتِ تبلیغ بالکل دوسری چیز ہے اور مداہنت فی الدین بالکل دوسری، ان معاملات میں مصلحت کی بنا پر رواداری ممکن نہیں ہے ـــــ البتہ تیسری قسم کے مسائل میں تشدد اور غلو کسی طرح جائز نہیں ہے۔ ان میں بھی مذاکرہ اور باہمی تبادلۂ خیال ہو سکتا ہے لیکن کسی ایک رائے یا مسلک کو بالجبر دوسروں پر ٹھونسنا کسی صورت میں درست نہیں۔ ہم اپنی اجتماعیت میں ایک ایسا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کریں گے جس میں ان اختلافی مسائل کے بارے میں انتہائی رواداری اور فراخ دلی پائی جائے۔

چھٹی خصوصیت جو قرارداد میں صراحت کے ساتھ مذکور ہو چکی ہے یہ ہے کہ اس میں "اَلْاَھَمُّ فَالْاَھَمُّ" کا اصول پیش نظر رکھا جائے گا اور تبلیغ و دعوت میں تدریج ملحوظ رہے گی ـــــ یہ تمام معاملات احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بصراحت مذکور ہیں۔

ساتویں خصوصیت اس اجتماعیت کی جیسا کہ قرارداد سے واضح ہے یہ ہوگی کہ اس کا دائرۂ کار صرف مسلمانوں تک محدود نہیں رہے گا بلکہ غیر مسلم بھی اس کے مخاطب ہوں گے۔ مسلمانوں کی خامیوں کی اصلاح بھی ہمارے فرائض دینی میں شامل ہے اور غیر مسلموں تک اسلام کی تبلیغ اور ان پر رسالتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی جانب سے اتمامِ حجت بھی ہماری دینی ذمہ داریوں میں سے ہے ہماری یہ اسلامی تنظیم انشاء اللہ اس ضمن میں بھی اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کوشاں ہوگی۔

پیش نظر تنظیم کی متذکرہ بالا خصوصیات تو وہ ہیں جو ہمارے مابین متفق علیہ ہیں اور ہماری قرارداد میں صراحۃً یا دلالۃً مذکور ہیں۔ اب میں بعض ایسی خصوصیات کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو

میری ذاتی رائے میں ہمیں اختیار کرنی چاہئیں۔ ان میں اختلاف کی گنجائش تو ہے لیکن مجھے امید ہے کہ ان میں سے اکثر کو آپ حضرات اپنے دل ہی کی آواز محسوس کریں گے۔

ان میں سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ ہمیں اذکار و اوراد کے معاملے میں یہ اصول متعین کر لینا چاہیے کہ ہم اوراد و وظائف اور اذکار و ادعیہ میں سے صرف ان کو اختیار کریں جو خدا کی کتاب یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت سے ماخوذ ہوں ان کا اوّلین فائدہ تو یہ ہوگا کہ ہم خدا اور رسول کے ساتھ جُڑے رہیں گے اور اس سے یقیناً ایک عظیم روحانی فائدہ ہوگا، اس کے ساتھ ہی اس سے افتراق و انتشار میں بھی کمی ہوگی۔ مختلف لوگ اپنے ذوق کے اعتبار سے مختلف اذکار اختیار کر لیں تو رفتہ رفتہ یہی ان کی مابہ الامتیاز خصوصیت بن جاتے ہیں اور اس سے ایک علیحدگی کا احساس پیدا ہو سکتا ہے، لہٰذا اس اعتبار سے بھی عافیت اسی میں ہے کہ صرف مسنون و ماثور ادعیہ و اذکار پر اکتفا کیا جائے۔

دوسری یہ کہ مثبت اور منفی دونوں کام سامنے رکھے جائیں۔ دین میں معروف کے امر کے ساتھ منکر کی نہی کا بھی حکم دیا گیا ہے اور احقاقِ حق کے ساتھ ابطالِ باطل کو بھی لازم ٹھہرایا گیا ہے، آجکل جو عام خیال پھیل گیا ہے کہ صرف مثبت کام کرنا چاہیے منفی کام نہیں کرنا چاہیے تو یہ میری ذاتی رائے میں ازروئے دین درست نہیں ہے ——— دعوت کا اچھے سے اچھا اسلوب اختیار کرنا اور حکمتِ تبلیغ کو پیشِ نظر رکھنا بالکل دوسری بات ہے اور انکارِ منکر اور ابطالِ باطل سے قطعاً صرفِ نظر کر کے صرف 'مثبت' باتوں کو پیش کرتے رہنا بالکل دوسری چیز ہے اور دینی غیرت و حمیت کا لازمی تقاضا میرے نزدیک یہ ہے کہ خلافِ دین و شرع امور پر برملا تنقید کی جائے، چاہے اس کا ہدف اصحابِ اقتدار بنتے ہوں چاہے عوام اس معاملے میں یہ پہلو بھی لائقِ توجہ ہے کہ آج کل حکومت کی خلافِ مذہب باتوں پر تنقید کرنے والے تو پھر بھی مل جاتے ہیں، عوام کو ان کی خلافِ دین باتوں پر ٹوکنے والا کوئی نہیں رہا جبکہ میری ذاتی رائے میں آج کے زمانے میں عوام کو وہی حیثیت حاصل ہے جو کبھی سلاطین و امراء کو حاصل تھی اور اس اعتبار سے ان کی نظری و عملی گمراہیوں اور ضلالتوں پر تنقید بھی "افضل الجہاد" کے حکم میں داخل ہو گئی ہے۔

تیسرے یہ کہ جاہلیتِ قدیمہ اور جاہلیتِ جدیدہ دونوں کا ابطال کیا جائے۔ یہ تو ہو سکتا ہے بلکہ غالباً یہی ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ جاہلیتِ قدیمہ کی بیخ کنی کی صلاحیت و قدرت سے مسلح ہوں اور کچھ دوسرے لوگ جاہلیتِ جدیدہ کے استیصال کی قدرت و طاقت رکھیں چنانچہ انہیں اپنے اپنے محاذوں پر کام کرنا ہوگا۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ یہ دونوں محاذ پیشِ نظر رہیں اور کسی سے صرفِ نظر نہ ہونے پائے۔

چوتھی کوشش پیشِ نظر تنظیم اسلامی میں اس امر کی ہونی چاہیے کہ نہ تو نری عقلیت پر انحصار کیا جائے اور نہ ہی نری جذباتیت پر دار و مدار ہو بلکہ عقل اور جذبے دونوں کو مناسب مقام پر رکھ کر کام کیا جائے جو بات کہی جائے وہ صرف عقلی ہی نہ ہو بلکہ دل سے بھی نکلے تاکہ اس کے مخاطب اہلِ عقل بھی ہوں اور صاحبانِ دل بھی۔ اور دعوت خود اہلِ عقل کے بھی دل میں گھر کر جائے!

پانچویں لازمی چیز جس کا پورا اہتمام ہماری اس تنظیم میں کیا جانا چاہیے یہ ہے کہ اس میں تنقید پر کوئی پہرا نہ لگایا جائے اور ایسی کوئی پابندی نہ لگائی جائے جس سے لوگوں کی زبانیں بند ہو جائیں۔ تنقید کے صحیح اسلامی آداب کی پابندی تو یقیناً لازم ہے لیکن تنقید کے دروازوں کو بند کر دینا پیشِ نظر تنظیم کی پیشگی ہلاکت کا سامان ہوگا۔ اس تنظیم کے اربابِ حل و عقد کا تنقید کو برداشت کرنے کی ہمت و صلاحیت سے مسلح ہونا ضروری ہے ——— اس کے ساتھ ہی یہ بھی لازمی ہے کہ پیشِ نظر تنظیم کا نظام شورائی ہو اور قرآن حکیم کی اس ہدایت کہ: "وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ" کا جیتا جاگتا نمونہ ہو۔

چھٹی خصوصیت ہماری اجتماعیت کی یہ ہونی چاہیے کہ اس میں زہدِ خشک اور تفریحِ بے قید کے مابین درمیانی کیفیت پیدا ہو اور نہ تو عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا کا نقشہ پیدا ہو جائے، نہ دوسری انتہا ہو کہ ہر وقت ہنسی دل لگی اور تفریح کا ماحول طاری رہے۔

اسی طرح 'رہبانیت' اور 'تنعّم' کے مابین درمیانی کیفیت کا پیدا کرنا بھی لازمی ہے۔ دین میں نہ قطعی ترکِ لذائذ کی ترغیب ہے اور نہ عیش پرستی کی گنجائش ہے۔ اللہ کی نعمتوں سے جائز طریقے سے متمتع ہونے کو برا سمجھنا بھی دین کی روح کے منافی ہے اور عیش کوشی بھی از روئے دین ممنوع ہے۔

ساتویں ضروری چیز جو قرار داد کی توضیح میں بہت وضاحت کے ساتھ آچکی یہ ہے کہ انتظامی اور تنظیمی امور میں دلچسپی کے ساتھ اسی درجہ کا گہرا شغف تعبدی امور میں ہونا لازمی ہے ورنہ بالکل یک رُخی شخصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں جن کی بدولت دینی تنظیموں میں بہت سی خرابیاں رُونما ہو جاتی ہیں۔ پیشِ نظر تنظیم میں ان شاء اللہ اس امر کی خصوصی نگہداشت کی جائے گی۔

آٹھویں اور آخری ضروری چیز یہ ہے کہ اپنے زمانے کے مخصوص فتنوں کا صحیح فہم اور ان کی اہمیت کا صحیح شعور حاصل کیا جائے۔ اس معاملے میں دین کے خادموں کو بالکل ماہر تشخیص طبیب کے مانند ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنے اپنے زمانے کی اصل اور بنیادی بیماریوں کی صحیح تشخیص کر سکیں۔ بصورتِ دیگر یہ ہو سکتا ہے اور بسا اوقات ہوتا ہے کہ ساری جد وجہد علامات کے خلاف ہوتی رہتی ہے۔ اور بیماری کی اصل جڑ جُوں کی توں قائم رہتی ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ کی نگاہِ حقیقت بین نے بالکل صحیح اندازہ کر لیا تھا کہ منعِ زکوٰۃ وغیرہ جیسے بظاہر 'فروعی' معاملات کی تہہ میں اصل مرض کون سا کام کر رہا ہے۔ اسی طرح حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی نگاہِ دُور رس نے بھی اپنے وقت کے فتنے کا صحیح صحیح اندازہ کر لیا تھا پھر ان کے بعد بھی تمام مجددین اپنے اپنے دَور کے فتنوں کی اہمیت کا اندازہ کر کے ان کے سدِباب کی سعی کرتے رہے، فجزاھم اللہ خیر الجزاء عن جمیع المسلمین۔ اپنے وقت کے امراض کی صحیح تشخیص کے لیے بڑی گہری بصیرت کی ضرورت ہے اور یہ چیز درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف ہی سے ہوتی ہے۔ تاہم اپنے مقدور بھر اس امر کی سعی ضروری ہے کہ کسی ایک ہی پٹی ہوئی راہ پر چلتے رہنے کے بجائے اس پر مسلسل غور وفکر اور تفکّر وتدبّر کیا جاتا رہے کہ ہمارے زمانے کے اصل فتنے کون سے ہیں اور ان کے سدباب کی صحیح راہ کون سی ہے۔

آخر میں ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کر کے اپنی معروضات کو ختم کرتا ہوں کہ جو کام کرنے کا عزم ہم نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے کیا ہے وہ بیک وقت آسان بھی ہے اور مشکل بھی، آسان اس اعتبار سے کہ یہ ہمارے دین کا تقاضا، ہماری فطرت کی پکار اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے پروردگار کی جانب سے عائد کردہ فرض ہے۔ لہٰذا اس کی ادائیگی کی سعی وجہد سے دلوں کو راحت اور قلوب کو اطمینان وسکون حاصل ہوگا۔ ۔ ۔ ۔ اور مشکل اس اعتبار سے کہ

بسا اوقات اس راہ کی مسلسل جد وجہد کا کوئی محسوس نتیجہ برآمد ہوتا نظر نہیں آتا اور انسان کو کمال صبر و استقامت کے ساتھ اپنی محنت کے نتائج و ثمرات سے بالکل بے نیاز ہو کر کام کیے جانا پڑتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ "اے علی! اگر اللہ تیرے ذریعے کسی ایک انسان کو بھی ہدایت کی راہ پر لے آئے تو یہ تیرے لیے سُرخ اونٹوں سے بہتر ہے"! بس یہی اس راہ کے ہر مسافر کا ماٹو (Motto) ہونا چاہیے اور اگر اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ ایک فردِ بشر کو بھی سیدھی راہ پر لے آئے تو اسے چاہیے کہ اس بات کو واقعۃً ایک دولتِ بے بہا اور نعمتِ غیر مترقبہ تصور کرے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ہمارے قلب و نظر کی کیفیت فی الواقع یہ نہ ہو جائے تو اس راہ میں ثابت قدم رہنا محال ہے۔

آخر میں میں اپنے اور آپ سب کے لیے اللہ تعالیٰ سے ہدایت و استقامت اور عفو و مغفرت کی دعا کرتا ہوں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

مولانا اصلاحی کا الوداعی خطاب

عزیز ساتھیو!

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے آپ نے ایک جماعتی نظم کے قیام کی قرارداد پر اتفاق کر لیا۔ میں اس پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کام کے لیے عزم و ہمت عطا فرمائے، اور ہر قدم پر ہماری دست گیری اور رہنمائی فرمائے ـــــ میں اس موقع پر آپ کے سامنے یہ اعتراف کرتا ہوں کہ ہر چند اس کی ضرورت اور اہمیت مجھ پر واضح تھی، لیکن میں دو سبب سے اس قسم کی ذمہ داری سے گریز کرتا رہا۔ ایک تو یہ کہ اب میرے قویٰ ضعیف ہو ہو رہے ہیں، کوئی بھاری بوجھ اُٹھانا میرے لیے ممکن نہیں رہا۔ دوسرا یہ کہ زندگی کے اِس آخری دور کے لیے اپنے ذوق کے مناسب جو کام میں نے تجویز کر لیا تھا، اب وقت و فرصت کا لمحہ لمحہ اس پر صرف کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ دوستوں کے شدید اصرار بلکہ دباؤ کے باوجود میں خود اس

کے لیے پہل کرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ دوستوں نے جب کبھی اس فریضہ کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی، میں ان کے دلائل کا تو انکار نہ کر سکا لیکن اپنی کمزوریوں اور مجبوریوں پر نگاہ کر کے اُن کی بات کو ٹالتا ہی رہا۔ میں یہ بھی محسوس کرتا رہا کہ اگرچہ میرے اوقات تمام تر دینی و علمی کاموں ہی میں بسر ہو رہے ہیں، تاہم معاشرے سے متعلق مجھ پر جو بھی فریضہ عاید ہوتا ہے اُس میں مجھ سے کوتاہی ہو رہی ہے، جس کے سبب نہ صرف میری بعض صلاحیتیں بگڑ رہی ہیں، بلکہ اندیشہ اس بات کا ہے کہ اس پر مجھ سے مواخذہ ہو۔ ان تمام احساسات کے باوجود میں اپنے آپ کو معذور سمجھتا رہا، جس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو معذور سمجھنے میں بڑا فیاض ہوتا ہے۔

بہر حال اب میں پورے شرحِ صدر کے ساتھ اس کام میں شریک ہوتا ہوں اور اُن تمام دوستوں کا دل سے شکرگزار ہوں جنھوں نے اس عظیم فرض کی اہمیت کو سمجھا اور ہم سب کو اس کے سمجھانے کا اہتمام کیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی طرف سے ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

میرے ذمہ اس وقت آپ تمام شرکائے مجلس کو بعض ضروری ہدایات دینے کا کام سپرد کیا گیا ہے۔ یہ ہدایات ان کاموں سے متعلق ہیں جو آپ کو یہاں سے رخصت ہونے کے بعد کرنے ہیں، براہِ کرم ان کو نوٹ کر لیجیے۔

جماعتی تنظیم سے متعلق اس وقت آپ کو پہلا کام یہ کرنا ہے کہ تنظیم کے نظام و دستور سے متعلق آپ کے سامنے جو تجویزیں ہیں وہ مقامی رفقاء سے مشورہ کے بعد قلم بند کر کے شیخ سلطان احمد صاحب کے پاس بھیج دیجیے تاکہ مجلس مشاورت اُن سے فائدہ اُٹھا سکے ——
حتی الوسع اس بات کی کوشش کیجیے کہ تجاویز کے بارے میں اگر اختلاف رائے ہو تو وہ غور و بحث سے مقامی رفقا ہی کے اندر طے ہو جائے، تاکہ آگے کا کام آسان ہو جائے۔ اگر غور و بحث کے بعد بھی کسی امر میں اختلاف باقی رہ جائے تو اس کو نوٹ کر دیا جائے۔

اپنی اور اپنے دوسرے بھائیوں کی اصلاح و تربیت سے متعلق جو کام آپ کو کرنے ہیں ان کے بارے میں مفصل ہدایات تو افرادی قوت کا جائزہ لینے کے بعد ہی دی جا سکیں گی لیکن چند کام ایسے ابتدائی اور بدیہی نوعیت کے ہیں کہ ان کا اہتمام بلا تاخیر آپ کو کرنا چاہیے۔

پہلا کام نماز کا اہتمام ہے۔ نماز ہمارے دین میں ایمان کا اوّلین تقاضا ہے۔ قرآن و حدیث

سے یہ بات ثابت ہے کہ اسلامی تنظیم کی شیرازہ بندی اسی چیز سے ہوتی ہے، اور انبیاء علیہم السلام نے اصلاح و تربیت کا پہلا قدم اسی سے اٹھایا ہے۔ آپ بھی اس کی پابندی کے لیے مضبوط عہد کیجئے اور اپنے عزیزوں، قریبوں، دوستوں، پڑوسیوں اور محلہ داروں کو بھی دلسوزی اور خیرخواہی کے ساتھ اس کی تلقین کیجئے۔ نماز کے اہتمام میں یہ بات بھی داخل ہے کہ حتی الوسع محلہ کی مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کیجئے بغیر کسی معقول عذر کے اس میں کوتاہی نہ کیجئے اور دوسروں کو بھی نماز باجماعت کی عظمت و اہمیت سمجھانے کی کوشش کیجئے۔!!

دوسرا کام یہ ہے کہ اپنے دینی علم میں اضافہ کا اہتمام کیجئے۔ جن مقامات پر یہ ممکن ہو کہ کسی ذی علم کی رہنمائی میں قرآن مجید کا اجتماعی مطالعہ کیا جا سکے، وہاں حلقۂ تدبر قرآن قائم کیجئے اور ہفتہ میں کم از کم ایک دن اس کام کے لیے خاص کیجئے کہ کچھ وقت قرآن کے فکر و مطالعہ میں بسر ہو۔ اس کے ساتھ اگر حدیث کی ایسی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا جائے جو اخلاقی احادیث پر مشتمل ہیں مثلاً ریاض الصالحین وغیرہ تو اس سے مزید خیر و برکت ہوگی۔ اگر کسی ذی علم کی رہنمائی حاصل نہ ہو تو عام حلقۂ مطالعۂ اسلامی قائم کیجئے اور منتخب اسلامی کتب کا التزام سے مطالعہ کیجئے۔ اس قسم کے حلقوں میں اپنے اُن دینی بھائیوں کو بھی شرکت کی دعوت دیجئے جن کے اندر دین اور علم دین کی رغبت محسوس کریں۔

آپ لوگوں میں سے جن لوگوں نے جدید تعلیم پائی ہو، اُن کو میں یہ مشورہ بھی دوں گا کہ وہ عربی زبان سیکھنے کی کوشش کریں، تاکہ وہ قرآن و حدیث سے براہِ راست استفادہ کر سکیں۔ بظاہر یہ کام مشکل نظر آتا ہے لیکن شوق اور طلب سے ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ اپنے اپنے شہروں میں جس عالم سے بھی اس کام میں آپ کو مدد ملنے کی توقع ہو اس سے استفادہ کیجئے۔ ہم خود بھی حالات کا جائزہ لینے کے بعد اس مسئلہ پر غور کریں گے کہ آسان طریقہ سے آپ کو عربی سکھانے کی کیا شکل اختیار کی جا سکتی ہے۔ لاہور میں اس سلسلہ میں ہم نے جو تجربے کیے ہیں، ہم ان سے بھی آپ کو آگاہ کریں گے تاکہ جن مقامات پر اس نہج پر درس جاری ہو سکے وہاں اس نہج پر درس جاری کیے جائیں۔

تیسرا کام یہ ہے کہ اپنے اپنے مقامات پر اپنے ہم خیال اور رفیق تلاش کیجئے جن کے

تعاون سے پیشِ نظر مقصد کو تقویت حاصل ہو۔ جو اس جدوجہد میں آپ کے لیے سہارا بن سکیں، جو آپ کی اصلاح کریں، اور جن کی آپ اصلاح کریں۔ جماعتی زندگی کی یہی خیر و برکت ہے جو انفرادی زندگی میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ یہ زمانہ بہت بُرا ہے لیکن اِس بُرے زمانے میں بھی اچھی رُوحیں اور نیک نفوس موجود ہیں، ضرورت ٹٹولنے اور جستجو کی ہے۔ جب آپ جستجو کریں گے تو اللہ کے بے شمار بندے ایسے مل جائیں گے جو آپ کی رفاقت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ کتنے نفوس ہوتے ہیں جن کے اندر دینی حِس موجود ہوتی ہے، لیکن کوئی اُس کو اُکسانے والا نہیں ہوتا، اِس وجہ سے وہ دبی ہوئی رہتی ہے۔ آپ ایسے نفوس تلاش کیجیے، اُن تک پہنچیے، اُن سے تبادلۂ خیالات کیجیے اور اس کام میں اُن کو تعاون کی دعوت دیجیے۔

آپ کی اجتماعی طاقت جتنی ہی بڑھتی جائے گی اتنی ہی ان کاموں کی انجام دہی آپ کے لیے آسان ہوتی جائے گی جو افراد اور معاشرہ کی اصلاح سے متعلق آپ پیشِ نظر رکھتے ہیں۔

یہ چند ابتدائی کام ہیں جو اس قرارداد کی روشنی میں، جو آپ نے پاس کی ہے، فی الفور شروع کیے جا سکتے ہیں۔ آگے اللہ مزید کاموں کی راہیں کھولے گا، اگر ہمارے اندر اس کے دین کی خدمت کے لیے اخلاص ہوگا۔ اب دُعا کیجیے کہ ہمیں اس کام کے لیے سچا عزم حاصل ہو اور ہر قدم پر توفیقِ الٰہی ہماری رہنمائی فرمائے!

تائید و تبصرہ

۱۔ مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم

ایک نیا اصلاحی ادارہ

لاہور کے ایک معزز دینی ماہنامہ 'میثاق' سے یہ معلوم کر کے دلی خوشی ہوئی کہ وہاں چند ذی فہم و بصیرت مخلصوں کی سعی و اہتمام سے ایک نئے دینی ادارہ کی بنیاد بالکل صحیح اصول پر پڑ رہی ہے۔ یہ حضرات زیادہ تر جماعتِ اسلامی سے نکلے ہوئے ارکان ہیں اور یقین ہے کہ یہ انشاء اللہ ان غلطیوں سے محفوظ رہیں گے، جن کا خوب تجربہ انہیں جماعت مذکور میں شامل رہ کر ہو چکا ہے۔ ادارہ کے ایک بانی مولانا امین احسن اصلاحی کی یہ بات آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے:

"جماعتیں اور تنظیمیں قائم تو ہوتی ہیں اصلاً کسی اعلیٰ و برتر نصب العین کے لیے لیکن قائم ہو جانے کے بعد وہ رفتہ رفتہ از خود نصب العین اور مقصد بن جاتی ہیں اور اصل نصب العین غائب ہو جاتا ہے!"

یہ 'صدق' کے مسلک کی صدفی صد ترجمانی ہے۔ مولانا اصلاحی کی تقریر کا یہ ٹکڑا بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے:

"اربابِ اقتدار کی ہر بات کو ہدفِ تنقید بنا لینا، یہاں تک کہ اُن کے خیر کو بھی شر قرار دے لینا، اور اُس کی مخالفت میں اِس حد تک بڑھ جانا کہ دوسروں کی بُرائیاں بھی اُن کے کھاتے میں ڈال دینا نہ عقل و منطق کی رُو سے جائز ہے اور نہ اسلام کی رُو سے۔ یہ اقتدار کی ہوس میں اندھے ہو جانے کی علامت ہے!"

اور پاکستان کی (ہندوستان کی نہیں) جماعتِ اسلامی کو شدید ترین نقصان شاید اسی چیز نے پہنچایا ہے۔ اللہ ہم کو پچھلی غلطیوں سے سبق لینے کی توفیق دے اور راہِ اصلاح و ہدایت مستقیم رکھے۔

خدمتِ دین کی گنجائشیں

"پاکستان کے دینی ماہنامہ 'میثاق' لاہور سے نئی دینی و اجتماعی تنظیم کے سلسلے میں:

"آخر میں اس امر کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ پیشِ نظر تنظیم ہرگز "الجماعت" کے حکم میں داخل نہ ہوگی۔ "الجماعت" کا مقام ہماری دانست میں اُمتِ مسلمہ کو بحیثیت مجموعی حاصل ہے۔ دین کی خدمت ایک نہایت وسیع و عریض کام ہے اور اس کے گوشے بے شمار ہیں۔ ہم ان تمام جماعتوں اور اداروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو کسی بھی گوشے میں دین کی خدمت کا کام کر رہی ہیں اور ان شاء اللہ اُن کے ساتھ ہمارا رویہ تعاون و تائید ہی کا ہوگا!"

بات اصلاً بہت موٹی اور بالکل صاف و واضح ہے، لیکن اس زمانے میں بہت بڑی بات ہے۔ دین و اُمت کی خدمت کے اتنے پہلو ہیں اور خدمت کے لیے گنجائش اتنی ہے کہ اگر نفسانیت کو چھوڑ کر تھوڑے سے بھی عزم و حوصلہ کے ساتھ خدمت کا ارادہ ہو تو خلوص اور فہم سلیم سے کام لینے والا ہر فردِ اُمت اس کے اندر کھپ سکتا ہے اور باہمی مناقشہ سے جو اب تک بڑا سنگِ راہ بنا ہوا ہے نجات پاکر ہر گروہ اپنے مذاق و استعداد کے لحاظ سے سچا خادمِ دین بن سکتا ہے!" (میثاق۔ لاہور، جنوری ۱۹۶۸ء بحوالہ "صدقِ جدید" ۱۷ نومبر ۱۹۶۷ء)

۲۔ مولانا عبدالباری ندوی مرحوم

فرنگی ساخت کی جماعت سازی اور اُس کی فتنہ سامانی!

"تازہ 'میثاق' میں زیادہ تر پرانی جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہونے والے حضرات جو ایک نئی جماعت بنا رہے ہیں اور جس کا ہمارے حضرت صاحب 'صدق' نے بھی خیر مقدم کیا ہے، اس کی تفصیلات معلوم ہوئیں۔ آپ کی تقریر کی جس بات کی صاحبِ صدق نے داد دی ہے، میں بھی اُسے ہی سب سے زیادہ قابلِ داد اور آپ زر کیا، آپ جواہر سے لکھنے کے قابل پاتا

ہوں۔ میں تو فرنگی ساخت کی جماعت سازیوں کے عین خمیر ہی میں اس فساد کو داخل جانتا ہوں، اور علی الاعلان کہا کرتا ہوں کہ یہ افتراق سازی کی بنیاد ہوتی ہے۔ انبیاء کا طریق یہ ہے کہ صاحب دعوت و عزیمت اپنی دعوت لے کر کھڑا ہوتا ہے اور بلا کسی مصنوعی جماعت سازی کے جو لوگ برضا و رغبت اس کے ساتھ شریک ہوتے ہیں، بس وہی "حزب اللہ" بن جاتے ہیں اور قواعد و ضوابط اور کثرتِ رائے وغیرہ کی بحث کے بغیر جب تک وہ داعی کے ساتھ چلتے رہتے ہیں تبھی تک خیر تیت رہتی ہے۔ باقی جہاں اقلیت و اکثریت وغیرہ کی رائے شماری اور صدر و سیکرٹری اور چندہ بازی وغیرہ کے جدید فرنگی طریقے داخل ہوتے، بس پھوٹ یقینی ہے کہ ایسی صورت میں جیسا آپ نے بالکل صحیح لکھا ہے (بالکل نفسیاتی طور پر) جماعت مقصود بن جاتی ہے اور اصل مقصود غائب ہوتے ہوتے بمنزلہ صفر ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جب تک غیر معمولی اخلاص و للّٰہیت کم و بیش تمام افرادِ جماعت میں نہ ہوں، جماعتی عصبیت و رقابت اس جماعت سازی کا لازمہ ہے۔ مجھے تو ہمیشہ الٰہ آباد کے عارفِ اکبر کا یہ عارفانہ شعر بار بار یاد آتا رہتا ہے، جس کے ذریعے اس طرز کی جماعت سازیوں کے آغاز ہی میں انہوں نے آگاہ فرما دیا تھا:

کریما بہ بخشائے بر حالِ بندہ   کہ ہستم اسیرِ کمیٹی و چندہ!

اور یہ سراپا ناکارہ . . . اور . . . کے حضرات سے یہی عرض کرتا رہتا ہے کہ اپنی جماعتوں کو توڑ دیں کہ اُن میں سے انجام کسی ایک کا بھی بخیر نہیں ہوا . . . میں جب آخر تک کوئی صدارت سے کنارہ کش ہونے سے راضی نہ ہوا تو بالآخر صدارت کو دو صدروں میں تقسیم کرنا پڑا!" (مولانا اصلاحی کے نام ایک خط سے ماخوذ)

حصّہ دوم

عقائد

یا بنیادی دینی تصوّرات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظیم اسلامی کے بنیادی دینی تصورات ـــــ یعنی عقائد ـــــ اہل سنت والجماعت کے مطابق ہیں، جن کی رُو سے: ہر عاقل و بالغ مسلمان خواہ وہ مرد ہو یا عورت، پر لازم ہے کہ وہ:

۱: پورے شعور و ادراک کے ساتھ اقرار کرے کہ:

اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَآئِہٖ وَصِفَاتِہٖ وَقَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْکَامِہٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ یعنی میں یقین رکھتا ہوں اللہ پر جیسا کہ وہ اپنے اسماء و صفات سے ظاہر ہے اور قبول کرتا ہوں اس کے جملہ احکام، اقرار کرتا ہوں زبان سے اور تصدیق کرتا ہوں دل سے! ـــــ اور

اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ ـــــ یعنی میں یقین رکھتا ہوں اللہ پر، اور اس کے فرشتوں پر، اور اس کی کتابوں پر، اور اس کے رسولوں پر، اور یوم آخر پر، اور تقدیر پر کہ اس کی بھلائی اور برائی سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے اور مرنے کے بعد جی اُٹھنے پر۔

تشریح: اسلام کی اساس ایمان پر قائم ہے اور ایمان کی تعبیر کے لیے ایمانِ مجمل اور ایمانِ مفصل کے مندرجہ بالا الفاظ جو سلف سے منقول ہیں بہت درجہ موزوں بھی ہیں اور نہایت جامع و مانع بھی۔ اس لیے کہ ان میں ایمانیات کی تفصیل کے علاوہ دو اہم اور بنیادی نکتے بھی واضح ہو جاتے ہیں: ایک یہ کہ ایمان زبانی اقرار (جو اُس قانونی ایمان یعنی اسلام کا رکنِ اوّلین ہے جس پر تمام دنیوی معاملات کا دارومدار ہے اور جس پر اسلامی ہیئتِ اجتماعی کی بنیاد قائم ہوتی ہے) اور تصدیقِ قلبی (جس پر اُس حقیقی ایمان کا دارومدار ہے جس کی بنا پر آخرت میں کوئی شخص مومن قرار پائے گا) دونوں کا مجموعہ ہے۔ اور دوسرے یہ کہ علمی و نظری اور اصولی اعتبار سے ایمان حقیقتاً ایمان باللہ ہی کا نام ہے۔ بقیہ تمام ایمانیات اسی اصل کی فروع اور اسی اجمال کی تفصیل ہیں۔ چنانچہ ایمان بالآخرت بھی اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حکمت و عدل ہی کا مظہر ہے اور ایمان بالرسالت بھی اس کی صفاتِ ربوبیت و ہدایت

ہی کی توسیع۔

اللہ وہ زندۂ جاوید ہستی ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا ـــــ وہ 'اَلْاَحَدُ' ہے یعنی ہر اعتبار سے تنہا اور اکیلا، چنانچہ نہ کوئی اس کی ذات میں شریک ہے نہ صفات میں، نہ حقوق میں نہ اختیارات میں، نہ اس کا کوئی ہم جنس ہے نہ ہم کفو، نہ ہم سر ہے نہ ہم پلہ، نہ ضد ہے نہ ند، نہ مثل ہے نہ مثال ـــــ وہ 'اَلصَّمَدُ' ہے یعنی وہ پورے سلسلۂ کون و مکان کا مبدع بھی ہے اور موجد بھی، خالق بھی ہے اور باری بھی، صانع بھی ہے اور مصور بھی، اور اسی کی توجہ و عنایت اسے تھامے ہوئے بھی ہے اور قائم کیے ہوئے بھی۔

وہ پاک اور منزہ و مبرا ہے ہر عیب، ہر نقص، ہر کمی، ہر ضعف، ہر احتیاج، ہر غلطی اور ہر کوتاہی سے، گویا وہ 'سُبُّوح' بھی ہے اور 'اَلْقُدُّوس' بھی ـــــ اور جامع ہے تمام محاسن و کمالات کا، اور ہر خیر اور خوبی کا بدرجہ تمام و کمال، گویا وہ 'اَلْغَنِیُّ' بھی ہے اور 'اَلْحَمِیْدُ' بھی، کسی کو کوئی قوت و طاقت حاصل نہیں بجز اس کے اذن و اجازت کے، گویا وہی 'اَلْعَلِیُّ' بھی ہے اور 'اَلْعَظِیْمُ' بھی اور 'اَلْمُتَعَالُ' بھی ہے اور 'اَلْکَبِیْرُ' 'اَلْمُتَکَبِّرُ' بھی ـــــ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔

اس کی ذات وراءُ الوراء ثم وراءُ الوراء ہے اور اس کی ماہیت اور کنہ کو کوئی نہیں جان سکتا اور اس کی معرفت کی واحد راہ اس کے اسماء و صفات کے واسطے ہی سے ہے چنانچہ تمام اچھے نام اسی کے ہیں اگرچہ متعین طور پر اس کے اسماءِ حسنیٰ وہی ہیں جو قرآن اور حدیثِ نبویؐ میں وارد ہوئے ـــــ اسی طرح وہ تمام صفاتِ کمال سے بتمام و کمال متصف ہے جن میں سے اہم ترین آٹھ ہیں یعنی حیات، علم، قدرت، ارادہ، سمع، بصر، کلام اور تکوین، چنانچہ وہی 'اَلْحَیُّ' بھی ہے اور 'اَلْقَیُّوْمُ' بھی اور 'اَلسَّمِیْعُ' بھی ہے اور 'اَلْبَصِیْرُ' بھی، "عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ" بھی ہے اور "بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ" بھی، "فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ" بھی ہے اور "اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ" کی شان کا حامل بھی ـــــ مزید برآں اس کی جملہ صفات اس کی ذات ہی کے مانند مطلق و لامتناہی ہیں نہ کہ محدود و مقید، اور قدیم ہیں نہ کہ حادث، اور ذاتی ہیں نہ کہ کسی اور کی عطا کردہ۔

فرشتے وہ برگزیدہ ہستیاں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے نُور سے تخلیق فرمایا۔ وہ صاحب تشخص وجود کے حامل ہیں نہ کہ مجرد قوائے طبعیہ، ان کا نہ مذکر ہونا معلوم ہے نہ مؤنث، وہ خدا سے قرب ضرور رکھتے ہیں لیکن الوہیت میں ان کا کوئی حصّہ نہیں، وہ اللہ کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا حکم انہیں بارگاہِ خداوندی سے ملے، وہ اللہ کے احکام کی تنفیذ بھی کرتے ہیں اور خالق و مخلوق کے مابین پیغام رسانی بھی، چنانچہ وہی انبیاء و رُسُل تک وحی لاتے رہے ہیں، ان کی تعداد بے شمار ہے لیکن چار بہت مشہور بھی ہیں اور جلیل القدر بھی یعنی حضرت جبرئیل، حضرت میکائیل، حضرت اسرافیل اور حضرت عزرائیل علیہم السلام۔

اللہ کی کتابوں میں سے بھی چار ہی معلوم و معروف ہیں، یعنی توراۃ جو حضرت موسیٰؑ کو عطا ہوئی اور زبور جو حضرت داؤدؑ کو عطا ہوئی اور انجیل جو حضرت عیسیٰؑ کو عطا ہوئی اور قرآن جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوا، جو اللہ کی آخری کتاب اور نوعِ انسانی کے نام اللہ کا آخری اور مکمل پیغام ہے، جس کے بعد کوئی اور کتاب نازل نہ ہوگی اور جو بِن و عَن محفوظ موجود ہے اور ہمیشہ رہے گا جبکہ باقی تینوں کتابیں ردّ و بدل اور تغییر و تحریف کا ہدف بن چکی ہیں، گویا اب قرآن ہی اُن کا 'مُصَدِّق' بھی ہے اور 'مُهَيْمِن' بھی ——— ان کے علاوہ اور بھی بہت سے پیغمبروں کو صحیفے عطا ہوئے جن میں سے کچھ اب دنیا میں سرے سے موجود ہی نہیں ہیں، باقی محرّف اور مبدّل ہیں۔

اللہ کے رسُول نوعِ انسانی کے وہ برگزیدہ افراد ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے بنی آدم تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے وقتاً فوقتاً چنا اور پسند فرمایا۔ وہ انسانیت کا اعلیٰ ترین نمونہ تھے اور سب گناہوں سے پاک یعنی معصوم تھے، ان کی تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے، قرآن مجید میں جن کے نام مذکور ہیں ان کے سوائے کسی اور کو یقین کے ساتھ نبی یا رسول قرار نہیں دیا جا سکتا، ان میں سے پانچ صد درجہ اولوالعزم اور نہایت عالی مرتبہ ہیں یعنی حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ——— ان میں سے بعض کو بعض پر بعض پہلوؤں سے جزوی فضیلت حاصل ہے لیکن جملہ انبیاء و رُسُل پر فضیلتِ کُلی سیدِ وُلدِ آدم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے، جو خاتم النبیین بھی ہیں اور آخر الرسل بھی۔ اور جن کے بعد وحیِ نبوت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے کُلی طور پر بند ہو چکا ہے۔

انبیاء و رسل کی تائید و تقویت کے لیے اللہ تعالیٰ عام مادی ضوابط کو عارضی طور پر معطل کر کے گویا عادی قانون کو توڑ کر اپنی آیات ظاہر کرتا اور معجزات دکھاتا رہا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بے شمار حسی معجزے عطا ہوئے لیکن آپ کا اہم ترین اور عظیم ترین معجزہ معنوی ہے یعنی قرآن حکیم۔

یوم آخر وہ دن ہے جس میں تمام انسان دوبارہ زندہ ہو کر عدالتِ خداوندی میں محاسبے اور جزا و سزا کے فیصلے کے لیے پیش ہوں گے جس کے نتیجے میں یا جنت میں داخلہ ہو گا یا جہنم میں ——— اس دن اقتدارِ مطلق اور اختیارِ کلی صرف اللہ واحد و قہار کے ہاتھ میں ہو گا۔ نہ کسی کو کسی جانب سے کوئی مدد مل سکے گی، نہ کوئی کچھ دے دلا کر چھوٹ سکے گا، نہ کوئی سفارش ہی خدا کی پکڑ سے بچا سکے گی۔ انبیاء و رُسل، صلحاء و اتقیاء، ملائکہ و ارواح اور سب سے بڑھ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مراتبِ عالیہ کے اظہار و اعلان اور ان کے اعزاز و اکرام کے لیے شفاعت کی اجازت دی جائے گی اور گناہ گار اہلِ ایمان کے حق میں ان کی شفاعت قبول بھی ہو گی لیکن نہ وہ خدا کی مرضی اور منشا کے خلاف کچھ کہیں گے اور نہ ہی خدا کی صفتِ عدل باطل ہو گی۔

تقدیر کے خیر و شر کا من جانب اللہ ہونا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے اور مخلوقات میں سے کسی کے بس میں نہیں کہ بغیر اس کی اجازت محض اپنے ارادے سے کچھ کر سکے لہٰذا یہاں جو کچھ ظہور پذیر ہوتا ہے، خواہ وہ کسی کو بھلا لگے یا بُرا، اللہ کے اذن ہی سے ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو خدا کا عاجز و لاچار ہونا لازم آتا ہے۔ مزید برآں، وہ "عَالِمُ مَا كَانَ وَمَا يَكُوْنُ" بھی ہے۔ چنانچہ اس پورے سلسلۂ کون و مکان میں جو کچھ ماضی میں ہوا، یا حال میں ہو رہا ہے یا مستقبل میں ہو گا سب اس کے علمِ قدیم میں پہلے سے موجود ہے، اگرچہ اس کا یہ علم جبرِ محض کو مستلزم نہیں ——— گویا ایمان بالقدر، دراصل اللہ تعالیٰ کی دو صفات یعنی قدرت اور علم کے مضمرات اور مقدرات ہی کو ماننے کا نام ہے!

بعث بعد الموت سے مراد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہو گا نفخۂ اولیٰ ہو گا جس کے نتیجے میں کائنات کا پورا موجود نظام درہم برہم ہو جائے گا اور سب پر ایک عمومی موت طاری ہو جائے گی۔ پھر جب اللہ کا اذن ہو گا نفخۂ ثانیہ ہو گا اور سب جی اٹھیں گے اور حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر

تاقیام قیامت پیدا ہونے والے آخری انسان تک سب میدانِ حشر میں جمع کیے جائیں گے۔

ب: کلمہ طیبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے جملہ مضمرات و مقدرات کے فہم و شعور کے ساتھ گواہی دے کہ:

اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوائے کوئی معبود نہیں وہ تنہا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔

تشریح: اس شہادت کے جزو اول کا مطلب یہ ہے کہ زمین اور آسمان اور جو کچھ آسمان و زمین میں ہے سب کا خالق، پروردگار، مالک اور تکوینی و تشریعی حاکم صرف اللہ ہے ان میں سے کسی حیثیت میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ گویا "اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ" اور "لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ"۔

اس حقیقت کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ:

۱۔ انسان اللہ کے سوا کسی کو ولی و کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا، فریادرس اور حامی و ناصر نہ سمجھے، کیونکہ کسی دوسرے کے پاس کوئی اقتدار ہے ہی نہیں۔

۲۔ اللہ کے سوا کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے والا نہ سمجھے، کسی سے تقوے اور خوف نہ کرے، کسی پر توکل نہ کرے، کسی سے امیدیں وابستہ نہ کرے، کیونکہ تمام اختیارات کا مالک تنہا وہ ہے۔

۳۔ اللہ کے سوا کسی سے دعا نہ مانگے، کسی کی پناہ نہ ڈھونڈے، کسی کو مدد کے لیے نہ پکارے، کسی کو خدائی انتظامات میں ایسا دخیل اور زور آور بھی نہ سمجھے کہ اس کی سفارش قضائے الٰہی کو ٹال سکتی ہو، کیونکہ خدا کی سلطنت میں سب بے اختیار رعیت ہیں، خواہ فرشتے ہوں یا انبیاء یا اولیاء۔

۴۔ اللہ کے سوا کسی کے آگے سر نہ جھکائے، کسی کی پرستش نہ کرے، کسی کو نذر نہ دے اور کسی کے ساتھ وہ معاملہ نہ کرے جو مشرکین اپنے معبودوں کے ساتھ کرتے رہے ہیں، کیونکہ تنہا ایک اللہ ہی عبادت کا مستحق ہے۔

۵۔ اللہ کے سوا کسی کو بادشاہ، مالک الملک اور مقتدرِ اعلیٰ تسلیم نہ کرے، کسی کو باختیارِ خود حکم دینے اور منع کرنے کا مجاز نہ سمجھے، کسی کو مستقل بالذات شارع اور قانون ساز نہ مانے اور اُن تمام اطاعتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دے جو ایک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے تحت اور اُس کے قانون کی پابندی میں نہ ہوں، کیونکہ اپنے ملک کا ایک ہی جائز مالک اور اپنی خلق کا ایک ہی جائز حاکم اللہ ہے۔ اس کے سوا کسی کو مالکیت اور حاکمیت کا حق نہیں پہنچتا نیز اس عقیدے کو قبول کرنے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ:

۶۔ انسان اپنی آزادی و خود مختاری سے دست بردار ہو جائے، اپنی خواہشِ نفس کی بندگی چھوڑ دے اور اللہ کا بندہ بن کر رہے جس کو اس نے الٰہ تسلیم کیا ہے۔

۷۔ اپنے آپ کو کسی چیز کا مالکِ مختار نہ سمجھے، بلکہ ہر چیز حتیٰ کہ اپنی جان، اپنے اعضاء اور اپنی ذہنی اور جسمانی قوتوں کو بھی اللہ کی ملک اور اس کی طرف سے امانت سمجھے۔

۸۔ اپنے آپ کو اللہ کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ سمجھے اور اپنی قوتوں کے استعمال اور اپنے برتاؤ اور تصرفات میں ہمیشہ اس حقیقت کو ملحوظ رکھے کہ اُسے قیامت کے روز اللہ کو ان سب چیزوں کا حساب دینا ہے۔

۹۔ اپنی پسند کا معیار اللہ کی پسند کو اور اپنی ناپسندیدگی کا معیار اللہ کی ناپسندیدگی کو بنائے۔

۱۰۔ اللہ کی رضا اور اس کے قرب کو اپنی تمام سعی و جہد کا مقصود اور اپنی پوری زندگی کا محور ٹھہرائے گویا اللہ تعالیٰ ہی اس کا محبوبِ حقیقی اور مطلوب و مقصودِ اصلی بن جائے۔

۱۱۔ اپنے لیے اخلاق میں، برتاؤ میں، معاشرت اور تمدن میں، معیشت اور سیاست میں، غرض زندگی کے ہر معاملے میں صرف اللہ کی ہدایت کو ہدایت تسلیم کرے اور ہر اُس طریقے اور ضابطے کو رد کر دے جو اللہ کی شریعت کے خلاف ہو۔

اس شہادت کے جزوِ ثانی سے واضح ہوتا ہے کہ سیدُ ولدِ آدم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپ اللہ کے بندے ہیں اور دوسرے یہ کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ پہلی حیثیت کے اعتبار سے آپ عبدیتِ کاملہ کے مقام پر فائز ہیں اور آپ کی اس حیثیت کے علم اور اعتراف سے شرک کی ان جملہ اقسام کا کامل سدباب ہو جاتا ہے جن میں سابقہ امتیں اپنے

اپنے انبیاء و رسل کے فرطِ احترام، شدتِ عقیدت اور غلوِ محبت کے باعث مبعوث ہوگئیں اور دوسری حیثیت کے اعتبار سے آپؐ کے فرقِ مبارک پر ختمِ نبوت اور ختمِ رسالت کا تاج بھی ہے اور آپ کے دستِ مبارک میں شہنشاہِ ارض و سما کی جانب سے اتمامِ نعمت، شریعت اور تکمیلِ دین حق کا فرمانِ شاہی بھی۔ گویا سلطانِ کائنات کی طرف سے روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کو جس آخری نبیؐ کے ذریعہ سے مستند ہدایت نامہ اور ضابطہ قانون بھیجا گیا اور جس کو اس ضابطہ کے مطابق کام کر کے ایک مکمل نمونہ قائم کر دینے پر مامور کیا گیا، وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اس امرِ واقعی کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ انسان کو جملہ مخلوقات میں شدید ترین محبت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہو اور آپؐ کی اطاعت اور اتباع ہی زندگی کا اصل طریق بن جائے گویا:

۱۔ انسان ہر اس تعلیم اور ہر اس ہدایت کو بے چون و چرا قبول کرے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔

۲۔ اس کو کسی حکم کی تعمیل پر آمادہ کرنے کے لیے اور کسی طریقہ کی پیروی سے روک دینے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہو کہ اس چیز کا حکم یا اس چیز کی ممانعت رسولِ خدا سے ثابت ہے۔ اس کے سوا کسی دوسری دلیل پر اس کی اطاعت موقوف نہ ہو۔

۳۔ رسولِ خدا کے سوا کسی کی مستقل بالذات پیشوائی و رہنمائی تسلیم نہ کرے۔ دوسرے انسانوں کی پیروی کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کے تحت ہو، نہ کہ ان سے آزاد۔

۴۔ اپنی زندگی کے ہر معاملے میں خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت کو محبت اور سند اور مرجع قرار دے، جو خیال یا عقیدہ یا طریقہ کتاب و سنت کے مطابق ہو اسے اختیار کرے، جو اس کے خلاف ہو اسے ترک کر دے، اور جو مسئلہ بھی حل طلب ہو اسے حل کرنے کے لیے اسی سرچشمہ ہدایت کی طرف رجوع کرے۔

۵۔ تمام عصبیتیں اپنے دل سے نکال دے خواہ وہ شخصی ہوں یا خاندانی، یا قبائلی و نسلی، یا قومی و وطنی، یا فرقی و گروہی۔ کسی کی محبت یا عقیدت میں ایسا گرفتار نہ ہو کہ رسولِ خدا کے لائے ہوئے حق کی محبت و عقیدت پر وہ غالب آجائے یا اس کی مدِ مقابل بن جائے۔

۶۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیدا ہونے والے کسی شخص کو نہ تو کسی بھی معنی میں نبی یا رسول

سمجھے، معصوم اور نہ ہی کسی کا یہ منصب اور مرتبہ سمجھے کہ اس کے ماننے پر انسان کا مومن و مسلم سمجھا جانا منحصر ہو۔

نیز اسی کے متضمنات کی حیثیت سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ:

۷۔ یہ تسلیم کیا جائے کہ آپؐ نے جو نظام قائم فرمایا اور جو خلافتِ راشدہ کے دوران بتمام و کمال قائم رہا، وہی 'دینِ حق' اور 'نظامِ اسلامی' کی صحیح ترین اور واحد مسلّم تعبیر ہے۔ گویا خلافتِ راشدہ فی الواقع "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" تھی۔ اور خلفائے اربعہ یعنی حضرات ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ اور علی حیدرؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ "خلفائے راشدین و مہدیین" ہیں جن کی سُنّت آنحضورؐ کے بعد دین میں حجت کا درجہ رکھتی ہے۔

۸۔ یہ یقین رکھا جائے کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جنہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور آپؐ کی تعلیم اور تزکیہ و تربیت سے براہِ راست فیضیاب ہونے کی سعادت نصیب ہوئی من حیث الجماعت پوری اُمت میں افضلیتِ مطلقہ کے حامل ہیں حتیٰ کہ کوئی غیرِ صحابی کسی صحابی سے افضل نہیں ہو سکتا۔ ان کی محبت جزوِ ایمان ہے، ان کی تعظیم و توقیر دراصل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و توقیر ہے اور ان سے بغض و عداوت اور ان کی تحقیر و توہین درحقیقت آنحضورؐ سے بغض و عداوت اور آپؐ کی تحقیر و توہین ہے ——— ان کے مابین جزوی فضیلت کے بہت سے پہلو ہو سکتے ہیں لیکن فضیلتِ کلّی متعین طور پر اس طرح ہے کہ تمام صحابہؓ میں ایک اضافی درجۂ فضیلت حاصل ہے حضراتِ اصحابِ بیعتِ رضوان کو، پھر ان پر ایک مزید درجۂ فضیلت حاصل ہے حضراتِ اصحابِ بدر کو، پھر ان پر ایک اور درجۂ فضیلت کے حامل ہیں حضرات عشرۂ مبشّرہ اور ان میں فضیلتِ مطلقہ حاصل ہے حضراتِ خلفاء اربعہ کو جن کی افضلیت علیٰ ترتیب الخلافت ہے یعنی افضل البشر بعد الانبیاء بالتحقیق ہیں حضرت ابوبکر صدیقؓ، پھر درجہ ہے حضرت عمر فاروقؓ کا، پھر مقام ہے حضرت عثمان غنیؓ کا اور پھر مرتبہ ہے حضرت علی حیدرؓ کا!

مزید برآں صحابۂ کرامؓ کل کے کل "عدول" ہیں اور ان کے مابین اختلاف و نزاع نفسانیت کی بنا پر نہیں بلکہ خطائے اجتہادی کی بنا پر ہوا۔ چنانچہ مشاجراتِ صحابہؓ کے باب میں محتاط ترین روش

تو یہ ہے کہ "کفِ لسان" سے کام لیا جائے اور کامل سکوت اختیار کیا جائے تاہم کوئی حقیقی اور واقعی ضرورت ہی لاحق ہو جائے تو ایک کو "مُصیب" یعنی صحیح موقف پر اور دوسرے کو "مُخطی" یعنی راہِ خطائے اجتہادی پر قرار دیا جاسکتا ہے لیکن کسی کو بھی سب وشتم یا الزام واتہام کا ہدف بنانا جائز نہیں ہے!

ج: ہر قسم کے کفر اور جملہ انواع واقسامِ شرک اور تمام رذائل وذمائمِ اخلاق سے شعوری طور پر اعلانِ برات کرے، بایں الفاظ کہ:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ اَنْ اُشْرِكَ بِكَ شَيْئًا وَّاَنَا اَعْلَمُ بِهٖ وَاَسْتَغْفِرُكَ لِمَا لَا اَعْلَمُ بِهٖ تُبْتُ عَنْهُ وَتَبَرَّاْتُ مِنَ الْكُفْرِ وَالشِّرْكِ وَالْكِذْبِ وَالْغِيْبَةِ وَالْبِدْعَةِ وَالنَّمِيْمَةِ وَالْفَوَاحِشِ وَالْبُهْتَانِ وَالْمَعَاصِيْ كُلِّهَا۔

یعنی "اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ تیرے ساتھ کسی کو جانتے بوجھتے شریک کروں اور تجھ سے مغفرت کا طلب گار ہوں اگر کبھی بے سمجھے بوجھے ایسا ہو جائے اور میں اعلانِ برات کرتا ہوں ہر نوع کے کفر سے، شرک سے، جھوٹ سے، غیبت سے، بدعت سے، چغلخوری سے، بے حیائی کے کاموں سے، بہتان طرازی سے اور جملہ نافرمانیوں سے"!

تشریح: ایمان کی طرح کفر کی بھی دو قسمیں ہیں ایک کفرِ حقیقی یا کفرِ قلبی، اور دوسرے کفرِ قانونی یا کفرِ ظاہری ——— کفرِ حقیقی یا کفرِ قلبی کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری و ناشکری اور اس کی ہر معصیت اور ہر نافرمانی پر ہو جاتا ہے لیکن جہاں تک اس کفرِ قانونی یا کفرِ شرعی کا تعلق ہے جس کی بنا پر کسی کی تکفیر کر کے اس کا رشتہ ملتِ اسلامی سے منقطع کر دیا جائے تو وہ ضروریاتِ دین میں سے کسی کے انکار ہی سے لازم آتا ہے، مجرد بے عملی یا نافرمانی حتیٰ کہ کبائر کے ارتکاب سے بھی لازم نہیں آتا۔

اسی طرح شرک کی بھی بے شمار اقسام ہیں مثلاً بعض شرک اعتقادی ہیں اور بعض صرف عملی،

بعض جلی ہیں اور بعض خفی، تاہم جملہ انواع واقسامِ شرک کا ایک احصاء اور احاطہ اس طرح ممکن ہے کہ ایک شرک فی الذات ہے یعنی یہ کہ کسی کو کسی اعتبار سے خدا کا ہم جنس، یا ہم کفو بنا دیا جائے جس کا کامل رد ہے سورۃ اخلاص میں۔ دوسرے شرک فی الصفات ہے یعنی کسی کو کسی صفت کے اعتبار سے خدا کا مثل یا مثیل بنا دیا جائے جس کا نہایت مکمل سدباب ہے آیت الکرسی میں، اور تیسرے شرک فی العقوق ہے جس کی جامع ترین تعبیر شرک فی العبادت ہے جس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کوئی خدا سے بڑھ کر یا اس جتنا محبوب و مطلوب ہو جائے اور یہ بھی کہ کسی کو عملی الاطلاق مطاع مان لیا جائے یعنی اس کی اطاعت خدا کی اطاعت سے آزاد تسلیم کر لی جائے، اور یہ بھی کہ عام مادی قانون اور ظاہری قواعد وضوابط کے دائرے سے باہر کسی سے استعانت اور استمداد واستغاثہ کیا جائے یا اس سے دعا کی جائے اور اسے پکارا جائے (عام مادی قوانین کے تحت بھی اگر کسی کے بارے میں یہ خیال ہو کہ محض اپنی قوت اور ارادے سے کسی کو نفع یا ضرر پہنچا سکتا ہے تو یہ شرک فی الصفات کی ایک قسم یعنی شرک فی القدرت اور شرک فی التصرف ہوگا) مزید برآں شرک کی اسی نوع کے ذیل میں آتے ہیں ریا اور سمعہ بھی اور کسی کے لیے کسی بھی نیت سے ان مراسم عبودیت کو بجا لانا بھی جو صرف اللہ کے لیے خاص ہیں جیسے سجدہ اور نذر!

رذائل و ذمائم اخلاق کی مکمل فہرست دینا ممکن نہیں۔ تاہم اگر انسان ان سے اجتناب کرے جو اوپر بیان ہوئے تو دوسروں کا سدباب خود بخود ہو جائے گا!

۵: سابقہ زندگی کے تمام گناہوں پر نہایت الحاح وزاری سے بارگاہِ خداوندی میں مغفرت کا طلب گار ہو اور آئندہ کے لیے کامل خلوص و اخلاص کے ساتھ توبہ کرے ان الفاظ کے ساتھ کہ:

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ اَذْنَبْتُهٗ عَمَدًا اَوْ خَطَاً سِرًّا اَوْ عَلَانِيَةً وَّ اَتُوْبُ اِلَيْهِ مِنَ الذَّنْبِ الَّذِیْ اَعْلَمُ وَمِنَ الذَّنْبِ الَّذِیْ لَا اَعْلَمُ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ وَسَتَّارُ الْعُيُوْبِ وَغَفَّارُ الذُّنُوْبِ۔

"یعنی میں اللہ سے معافی کا خواستگار ہوں تمام گناہوں پر خواہ میں نے جان

بوجھ کر کیے ہوں یا غیر ارادی طور پر، اور خواہ چھپ چھپا کر کیے ہوں خواہ علانیہ طور پر، اور خواہ وہ میرے علم میں ہوں خواہ میرے علم میں نہ ہوں۔ اے اللہ تو ہی تمام غیبوں کا جاننے والا اور تمام عیبوں کی پردہ پوشی کرنے والا اور تمام گناہوں کی بخشش فرمانے والا ہے!

تشریح: توبہ صرف زبان سے کلماتِ توبہ کے ادا کر دینے یا ان کے ورد یا وظیفہ بنا لینے کا نام نہیں ہے بلکہ گناہ پر حقیقی ندامت اور واقعی پشیمانی اور معصیت سے کلی اجتناب کے عزمِ مصمم کے ساتھ بارگاہِ خداوندی میں رجوع کرنے اور گناہ و معصیت کو بالفعل ترک کر دینے کا نام ہے۔ یہ تین شرائط ان کوتاہیوں کے ضمن میں کافی ہیں جو حقوق اللہ کے باب میں ہوں۔ حقوق العباد سے تعلق رکھنے والے معاصی کے لیے ایک چوتھی اضافی شرط یہ ہے کہ جس کسی پر زیادتی ہوئی ہو اس کی تلافی کی جائے یا اس سے معافی حاصل کی جائے۔

بنابریں توبہ کی صحت کے لیے لازم ہے کہ جو شخص تنظیم اسلامی میں شمولیت کا خواہاں ہو وہ:

۱۔ جملہ فرائضِ دینی کی پابندی اختیار کرے اور تمام کبائر سے فی الفور مجتنب ہو جائے بالخصوص ارکانِ اسلام کی پوری پابندی کرے۔ چنانچہ نماز قائم کرے (مردوں کے لیے التزامِ جماعت بھی ضروری ہے) رمضان المبارک کے روزے رکھے، صاحبِ نصاب ہو تو باقاعدہ حساب کے ساتھ پوری زکوٰۃ ادا کرے۔ اور صاحبِ استطاعت ہو اور تا حال حجِ بیت اللہ نہ کیا ہو تو فوراً نیت کرے اور جلد از جلد فریضۂ حج ادا کرے۔

۲۔ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا زیادہ سے زیادہ اتباع کرے اور ایسی تمام بدعات اور رسومات کو ترک کر دے جن کا ثبوت قرونِ مشہود لہا بالخیر میں نہ ملتا ہو۔

تشریح: ان بدعات و رسومات کا زیادہ زور شادی بیاہ، پیدائش، عقیقہ، ختنہ، سالگرہ، فوتیدگی اور تیواروں کے مواقع پر ہوتا ہے۔ ان سب میں لازم ہوگا کہ اپنے معاملات کو زیادہ سے زیادہ قرونِ اولیٰ کے مطابق بنایا جائے اور بعد کے اضافوں کو ترک کر دیا جائے۔

۳۔ اپنی معاشرت میں جملہ اسلامی احکام کی پابندی کرے خصوصاً ستر اور حجاب کے شرعی احکام پر عمل پیرا ہو۔

۴۔ اگر کوئی ایسا ذریعۂ معاش رکھتا ہو جو معصیتِ فاحشہ کے ذیل میں آتا ہو جیسے چوری، ڈاکہ، سود، زنا، شراب، رقص و سرود، شہادتِ زور، رشوت، خیانت، جُوا اور سٹہ وغیرہ تو اسے ترک کر دے۔

تشریح: اس بات کا تو بظاہر احوال کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ وہ لوگ تنظیمِ اسلامی میں شمولیت کے خواہاں ہوں جن کی معاش چوری یا ڈاکہ، شراب کی تیاری یا اس کی فروخت وغیرہ، عصمت فروشی یا رقص و سرود ایسے قبیح کاموں سے متعلق ہوں تاہم اگر اللہ تعالیٰ ایسے کسی کاروبار سے متعلق کسی فرد کو اصلاح کی توفیق دے تو یہ بھی اس کی رحمت سے بعید نہیں۔ بہرصورت ان تمام کاموں کی حرمت اور قباحت و شناعت ہمارے معاشرے میں معلوم و معروف ہے ــــــ البتہ بعض حرام چیزیں کچھ اس طرح ہمارے معاشرے میں جاری و ساری ہو گئی ہیں کہ عام لوگ یا تو اُن کی قباحت سے ہی آگاہ نہیں رہے یا انہوں نے کسی مجبوری کے عذر کی بنیاد پر اُن کو اپنے لیے مباح کر لیا ہے۔ ان میں سے مکروہ ترین چیز ہے سُود، جس سے باز نہ آنے پر قرآن حکیم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اعلانِ جنگ کی وعید سناتا ہے اور دوسرے نمبر پر ہے رشوت اور سرکاری حیثیت اور اختیار کا ناجائز استعمال اور ان پر مستزاد ہیں بیع و شرا کی بعض ناجائز صورتیں اور سرکاری محاصل (انکم ٹیکس، کسٹم ڈیوٹی وغیرہ) سے بچنے کے لیے اخفاء و کذب بیانی۔

ہمیں خوب اندازہ ہے کہ اس وقت جو خدا ناشناس اور عاقبت ناآشنا نظام پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے اور پورا انسانی معاشرہ بحیثیتِ مجموعی جس فسادِ اخلاقی میں مبتلا ہے اس کے پیشِ نظر ان تمام چیزوں سے کامل اجتناب نہایت مشکل اور صبر آزما کام ہے لیکن تنظیمِ اسلامی جن مقاصد کے لیے قائم کی جا رہی ہے اس کے پیشِ نظر لازم ہے کہ اس سے عملی وابستگی کے لیے وہی لوگ آگے بڑھیں جو رخصتوں اور حیلوں پر عمل کرنے کے بجائے عزیمت اور صبر و توکل کو اپنا شعار بنائیں اور ہر اس ذریعۂ معاش کو ترک کرنے کی کوشش کریں جس میں حرام کی آمیزش ہو۔ اس معاملے میں سرِدست حسبِ ذیل تصریحات پر اکتفا کی جاتی ہے:

(i) سُود لینا اور دینا قطعاً حرام ہیں لہٰذا بنکوں یا دیگر اداروں سے نہ کبھی کوئی رقم کسی بھی غرض کے لیے سُود پر قرض لینا جائز ہے نہ سیونگ اکاؤنٹ یا فکسڈ ڈیپازٹ یا نفع نقصان کی کسی بھی دوسری صورت میں سرمایہ لگانا درست ہے۔ چنانچہ بنکوں سے صرف [illegible] ترسیل

زر یا لاکرز سے انتفاع یا زیادہ سے زیادہ کرنٹ اکاؤنٹ رکھنے کی سہولت حاصل کی جاسکتی ہے۔

(ii) کسی ایسے کاروباری ادارے کی ملازمت جائز نہیں ہے جس میں سود کو غالب عنصر کی حیثیت حاصل ہو جیسے بنک اور انشورنس کمپنیاں۔

(iii) رشوت لینا اور دینا دونوں حرام ہیں۔ البتہ کسی ایسی صورت میں کہ کسی ظالم اہل کار یا صاحب اختیار کو اپنا جائز حق وصول کرنے کے لیے کچھ مجبوراً دینا پڑے تو اس کا شمار استحصال بالجبر میں ہوگا رشوت میں نہیں۔ البتہ یہ صرف اسی صورت میں ہوگا کہ نہ کوئی ناجائز انتفاع مطلوب ہو، نہ کسی سرکاری قانون اور پابندی سے بچنا مقصود ہو اور نہ ہی کسی اور کے جائز حقوق پر زد پڑتی ہو۔

(iv) سرکاری محاصل کے ضمن میں جتنی رعائتیں مروجہ قانون کے اندر اندر ممکن ہوں ان سے بڑھ کر کسی ایسی صورت کو اختیار کرنا درست نہیں ہے جس میں کذب، فریب اور شہادت زور شامل ہوں۔

(v) کاروبار کی مختلف صورتوں میں سے بھی جن جن میں بیع فاسد یا جوئے یا سٹے یا احتکار وغیرہ کا عنصر شامل ہو اس سے بچنا لازم ہے۔

(vi) اگر اس کے قبضے میں ایسا مال یا جائداد ہو جو حرام طریقے سے آیا ہو یا جس میں حق داروں کے تلف کردہ حقوق شامل ہوں تو اس سے دستبردار ہو جائے اور اہل حقوق کو ان کے حق پہنچا دے۔ البتہ یہ عمل صرف اس صورت میں کرنا لازم ہے جب کہ حق دار بھی معلوم ہوں اور وہ مال بھی معلوم و متعین ہو جس میں ان کا حق تلف ہوا ہے۔ بصورتِ دیگر توبہ اور آئندہ کے لیے طرزِ عمل کی اصلاح کافی ہوگی۔

۵: گہرے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ اعلان کرے کہ وہ ہر طرف سے یکسو ہو کر صرف اللہ کا ہو کر رہے گا، رضائے الٰہی ہی اس کا اصل مقصود و مطلوب ہوگی اور نجات و فلاحِ اُخروی کا حصول ہی اس کا اصل نصب العین ہو گا ——— اور جس طرح اس کی نماز اور قربانی صرف اللہ کے لیے ہوگی اسی طرح اس کے جسم و جان، مال و منال حتیٰ کہ زندگی اور موت سب اللہ ہی کے لیے ہوں گے۔ یعنی

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا

اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ ـــ اور ـــــ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ
وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ج وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ
اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ○

تشریح: ہر ذی شعور مسلمان کا اوّلین فرض یہ ہے کہ وہ اللہ کی محبت سے سرشار ہو کر اپنی پوری زندگی اس کی کامل اطاعت میں دیدے (جو لازماً اطاعتِ رسولؐ ہی کے واسطے سے ہوگی!) اسی رویّے کا نام عبادتِ ربّ ہے جو ہر انسان سے اللہ کا پہلا مطالبہ ہے اور جس کی طرف نوعِ انسانی کو دعوت دینے کے لیے تمام انبیاء و رسل مبعوث ہوتے اور جو از روئے قرآن جنوں اور انسانوں کا عین مقصدِ تخلیق ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس پر لازم ہے کہ اپنی صحت و قوت، فرصت و فراغت، صلاحیت و استعداد، مال و دولت، اور وسائل و ذرائع کا زیادہ سے زیادہ حصّہ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، احقاقِ حق اور ابطالِ باطل، دعوت الی اللہ اور تبلیغ دین، نصرتِ خدا و رسولؐ اور حمایت و اقامتِ دین، اور شہادتِ حق علی الناس، اور اظہارِ دینِ حق علی الدین کلّہ کے لیے وقف کر دے اور اس کے لیے محنت و مشقت، انفاق و ایثار، ترک و اختیار، ابتلا و آزمائش، صبر و مصابرت، استقامت و مقاومت ـــــ الغرض ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کے جملہ مراحل کے لیے مقدور بھر ہمت و عزیمت کی راہ اختیار کرے۔ یہ تمام فرائض ہر مسلمان پر حسبِ صلاحیت و استعداد اور مطابقِ وسعت و قوت عاید ہوتے ہیں اور ان کی انجام دہی میں ہی بندے کی وفاداری کا اصل امتحان ہے!

و: خدا کو حاضر و ناظر جانتے ہوئے اور "اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا" کے پیشِ نظر پورے احساسِ مسئولیت کے ساتھ عہد کرے کہ اپنے فرائضِ دینی کی انجام دہی کے لیے وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مبارک کہ "اَنَا اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ: بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" کے مطابق تنظیمِ اسلامی کے نظم کی پوری پابندی کرے گا۔

تشریح: یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ تنظیمِ اسلامی نہ عام معنی میں مذہبی یا سیاسی جماعت

ہے نہ محدود مفہوم میں مذہبی تنظیم بلکہ یہ ایک ہمہ گیر دینی جماعت ہے لہٰذا اگرچہ یہ خیال کرنا تو غلطی ہی نہیں عظیم گمراہی ہوگی کہ یہ اُس "الجماعت" کے حکم میں ہے جس میں شمولیت اسلام میں داخلے اور جس سے علیحدگی کفر کے مترادف ہے اور جس کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ" یعنی جو اس سے علیحدہ ہوگا وہ علیحدہ ہی جہنم میں جھونک دیا جائے گا ـــــ تاہم اس کے نظم کو عام معاشرتی و ثقافتی انجمنوں یا طبقاتی و پیشہ ورانہ تنظیموں یا سیاسی و قومی جماعتوں کے قواعد و ضوابط کی پابندی پر بھی قیاس نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کی "اطاعت فی المعروف" ـــــ "سمع وطاعت" کے خالص اسلامی اور ٹھیٹھ دینی اصول کے مطابق تمام شرکائے تنظیم پر واجب ہے۔

وَعَنْ

عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رضی اللہ عنہ

قَالَ: بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ

عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ

فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ

وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ

وَعَلَى أَثَرَةٍ عَلَيْنَا

وَأَنْ لَا نُنَازِعَ الْأَمْرَ أَهْلَهُ، إِلَّا أَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ

مِنَ اللّٰهِ فِيهِ بُرْهَانٌ،

وَعَلَى أَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ أَيْنَمَا كُنَّا، لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ

لَوْمَةَ لَائِمٍ (بخاری و مسلم)

تنظیمِ اسلامی کا پیغام نظامِ خلافت کا قیام

تنظیمِ اسلامی

مروجہ مفہوم کے اعتبار سے

نہ کوئی سیاسی جماعت ہے نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک

اسلامی انقلابی جماعت ہے

جو اوّلاً پاکستان میں اور بالآخر ساری دنیا میں دینِ حق یعنی

اسلام کو غالب یا بالفاظ دیگر نظامِ خلافت

قائم کرنا